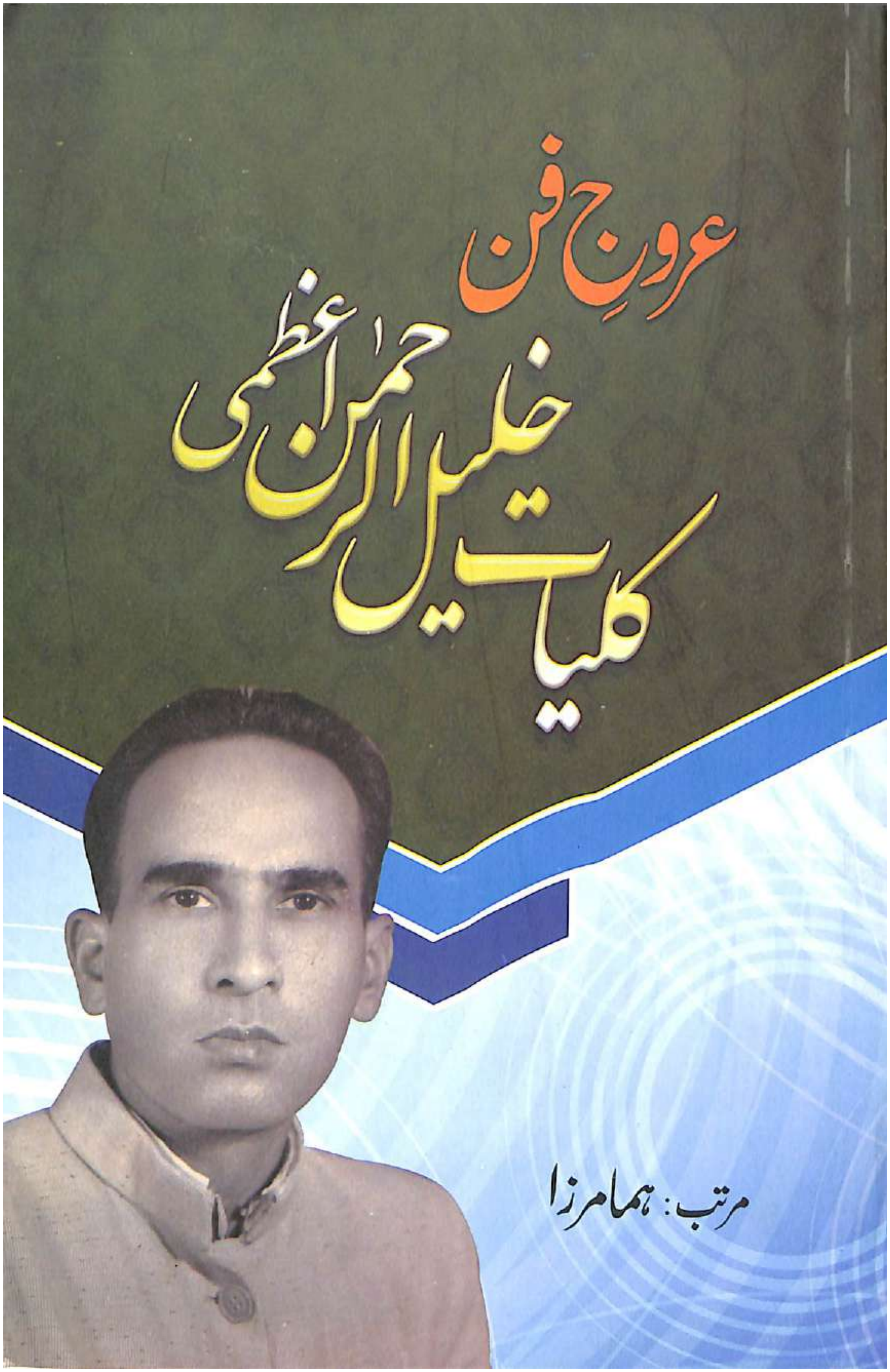
عروجِ فن
کلیاتِ خلیل الرحمن اعظمی
مرتب: ہما مرزا

عروجِ فن

کلیاتِ خلیل الرحمٰن اعظمی

مرتب

ہما مرزا

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون ایف سی، 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت : 2018
تعداد : 550
قیمت : -/145 روپے
سلسلۂ مطبوعات : 1971

UROOJ-e-FUN : Kulliyat-e-Khalilur Rahman Azmi
By: Huma Mirza

ISBN :978-93-87510-09-8

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک۔8، آر۔کے۔پورم، نئی دہلی۔110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای۔میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: ہائی ٹیک گرافکس، ڈی 8/2، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز II، نئی دہلی۔110020
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جا سکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل

برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ تنقیدیں اور دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کی ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

پروفیسر سید علی کریم
(ارتضیٰ کریم)
ڈائرکٹر

فہرست

	مقدمہ	ہما مرزا	XIII
	خلیل الرحمٰن اعظمی، گزشتگان سے آئندگان تک	شمس الرحمٰن فاروقی	XXXIII

کاغذی پیرہن

	ابتدایہ	خلیل الرحمٰن اعظمی	XLIX

نقشِ اوّل

1	میرا گھر، میرا ویرانہ	2
2	یاد	3
3	تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا	4
4	شامِ اودھ	5
5	لہو کی تحریر	6
6	شامِ وداع	7
7	برہ کی ریکھا	9
8	جن راتوں میں نیند نہ آئے	10
9	جاگتے سائے	11
10	لمحۂ جاوداں	13

11 آخری رات 15

12 آپ بیتی 17

13 کہانیاں 21

نئی فصل

کاغذی پیرہن 26

1 بن لکھی کہانی 28

2 میرے اُداس دل نہ رو 29

3 نیا جنم 30

4 بہ ہنگامِ وصل 33

5 دوری 34

6 گیتانجلی 35

7 نذرانے 36

8 کنجِ محبت 37

9 بہار کی واپسی 38

10 اپنی یاد 40

11 سورج مکھی کا پھول 41

12 میرے خوابوں کی سرزمیں 41

13 سفرنامہ 43

14 آدمیوں کے میلے 44

15 اپنی تصویر سے 45

16 متھلا دیس 46

لمحے آوارہ

غزلیں 50

پتہ پتہ، بوٹا بوٹا

اشعار 74

- رُباعیات 79
- بھجن 80

اختتامیہ اسلوب احمد انصاری 83

نیا عہد نامہ

دیباچہ خلیل الرحمٰن اعظمی 105

غزلیں:

1 وہ دن کب کے بیت گئے جب دل سپنوں سے بہلتا تھا 118
2 نہیں اب کوئی خواب ایسا تری صورت جو دکھلائے 119
3 نشۂ مے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں 119
4 ہنگامۂ حیات سے جاں بر نہ ہو سکا 120
5 میرے شعروں سے بھی بڑھ کر تری صورت ہے حسیں 121
6 تجھ سے بچھڑ کے دل کی صدا کو بکو گئی 122
7 ابھی جی بھر کے پی لو پھر نہ یہ موسم بدل جائے 122
8 شراب ڈھلتی ہے شیشے میں، پھول کھلتے ہیں 123
9 زندگی بھی مرے نالوں کی شناسا نکلی 124
10 بہت دنوں میں نے کنجِ خلوت میں اپنی آواز ہی سنی ہے 124
11 آج ڈوبا ہوا خوشبو میں ہے پیراہنِ جاں 125
12 ہر خار و خس سے وضع نبھاتے رہے ہیں ہم 126
13 سوئی ہے کلی دل کی اس کو بھی جگا جانا 126
14 کوئی تم جیسا تھا، ایسا ہی کوئی چہرا تھا 127
15 اس در پہ بھی لگتا نہیں جی دیکھیے کیا ہو 128
16 اب کے آئی جو مری رہ میں تو پامال رہی 129
17 وہ حسن جس کو دیکھ کے کچھ بھی کہا نہ جائے 129
18 ہے عجیب چیز مئے جنوں، کبھی دل کی پیاس نہیں بجھی 130
19 پینا نہیں حرام، ہے زہرِ وفا کی شرط 131

20 خود چلے آؤ یہاں یا کہ صدا دو ہم کو 132
21 تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے 133
22 وہ رنگِ رُخ، وہ آتشِ خوں کون لے گیا 133
23 ایک سی بے رنگ صبحیں، ایک سی بے کیف شام 134
24 ہم وہ ہیں باز نہ آئیں گے ابھی جینے سے 135
25 ترتیب دے رہا ہوں دیوانِ عاشقی کو 135
26 اے ناصحو نہ اور کوئی گفتگو کرو 136
27 میں ترے غم میں اب نہیں ناشاد 137
28 تو بھی اب چھوڑ دے ساتھ اے غمِ دنیا میرا 138
29 کہوں یہ کیسے کہ جینے کا حوصلہ دیتے 138
30 میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں 139
31 یہ الگ بات کہ ہر سمت سے پتھر آیا 140
32 رخصت ہوئے یہ کہہ کر اس شوخ کی گلی سے 141
33 دل کی رہ جائے نہ دل میں یہ کہانی کہہ لو 142
34 اتنی لمبی ہے کہانی کہیں دم ٹوٹ نہ جائے 142
35 تجھ پہ ہے سب کی عنایت، ہیں تجھی پر سب عذاب 143
36 بس کہ پابندیٔ آئینِ وفا ہم سے ہوئی 144
37 اظہارِ حقیقت میں دل و جاں کا زیاں ہے 145

نظمیں

1 بن باس 147
2 پیمانِ وفا 149
3 خلوت کا چراغ 150
4 فاصلہ 151
5 بھیرویں 152
6 آنچل کی چھاؤں میں 153

7	سایۂ دیوار		154
8	اپنے بچے کے نام		155
9	دوسری ملاقات		156
10	پل بھر کا سوانگ		157
11	شام		158
12	رفتگاں		159
13	سوداگر		160
14	تسلسل		161
15	نیا عہد نامہ		162
16	وجدان		164
17	سلسلے سوالوں کے		165
18	خوابوں سے ڈر لگتا ہے		166
19	قیدی		166
20	دن کے خواب		167
21	میں اور "میں"		168
22	بدلتے موسم		168
23	تنہائی سے آگے		169
24	ذاتیات		170
ہجویات			
1	تذکرہ شعرائے اردو		172
2	نقد نامہ		173
3	شہر آشوب		175
4	ناجنس		179
زندگی اے زندگی			
	چند باتیں	بیگم راشدہ خلیل	185

نعت

1	تھکے ماندوں کو جب بھی مل گیا رستہ محمدؐ کا	187
2	میں غلامِ مصطفیٰؐ ہوں، میں ہوں شیدائے رسولؐ	187
3	بھر دے، بھر دے میرا پیالہ، او مرے کالی کملی والے	188

غزلیں

1	خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں	189
2	آئے ہیں اور گزرے ہیں کتنے ہی ماہ و سال	190
3	کٹی پھٹی سی یہ روحیں، گلے سڑے یہ بدن	190
4	سوتے سوتے چونک پڑے، ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا	191
5	ہر ہر سانس نئی خوشبو کی اک آہٹ سی پاتا ہے	192
6	ہوا کے جھونکے جو آئیں تو ان سے کچھ نہ کہو	192
7	دیکھنے والا کوئی ملے تو دل کے داغ دکھاؤں	193
8	کیوں شمع بجھ کے رہ گئی کیسی ہوا لگی	193
9	ہر گھڑی عمرِ فرومایہ کی قیمت مانگے	195
10	خود بخود دور کبھی دل کا اندھیرا نہ ہوا	195
11	کہاں کھو گئی روح کی روشنی	196
12	بدلتا رہتا ہے کیا رنگ آسماں دیکھو	197
13	کیا قیامت ہے کہ ہم خود ہی کہیں خود ہی سنیں	197
14	بنے بنائے سے رستوں کا سلسلہ نکلا	198
15	یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی	199
16	چکھی ہے لمحے لمحے کی ہم نے مٹھاس بھی	199
17	کیوں میں بے حس بن کے اوروں کی طرح سے زندہ ہوں	200

نظمیں

1	ان کہی	201
2	نیا آدمی	202

3 پچھلے جنم کی کتھائیں 208

4 حروف والفاظ کے ذخیرے 209

5 میں گوتم نہیں ہوں 210

6 آئینہ در آئینہ 211

7 لمحے کی موت 212

غزلیں

1 دنیاداری تو کیا آتی، دامن سینا سیکھ لیا 214

2 یہ مانا ہم نے یہ دنیا انوکھی ہے نرالی ہے 214

3 کیوں رو رو کر نین گنوائیں، رونے سے کیا ہوتا ہے 215

4 گھر میں بیٹھے سوچا کرتے، ہم سے بڑھ کر کون دُکھی ہے 215

5 میں کہاں ہوں کچھ بتا دے، زندگی اے زندگی 216

6 اک پل نہیں قرار کہ گردش بہت ہے یاں 216

7 اپنی بستی چھوڑ کر پردیس میں جائیں گے کیا 217

8 جی میں ہے معنی بے لفظ کو کیوں کر باندھوں 218

9 میرے آنگن کو مہکا دو 218

10 پھر مری راہ میں کھڑی ہوگی 219

11 کہاں کی مے، کہاں کے جام و مینا 220

12 یہ تو میرا اپنا گھر ہے تم اپنے گھر میں جاؤ میاں! 221

13 شکستہ تر ہے جو اس خواب کے حصار میں ہوں 221

14 اگرچہ غیر کے ہاتھوں لہولہان ہوا 222

15 رُخ پہ گردِ ملال تھی کیا تھی 223

16 جلتا نہیں اور جل رہا ہوں 224

17 اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا 226

18 درمیاں خود اپنی ہستی ہو تو ہم بھی کیا کریں 227

19 ہم تو گدائے گوشہ نشیں ہیں ہم کو غرورِ کمال نہیں 228

20	طرز جینے کے سکھاتی ہے مجھے	228
21	سایہ ہوں کوئی کہ اب شفق ہوں	229
22	ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا	230
23	متفرق اشعار	231
24	کتبہ 1	232
25	کتبہ 2	232
26	کتبہ 3	233
27	کتبہ 4	234
28	کتبہ 5	235
29	کتبہ 6	236

نظمیں

1	بھائی	237
2	نیند پیاری نیند	238
3	مٹی کا گیت	239
4	نظم بلاعنوان	241
5	نظم بلاعنوان	243
6	لڈو پی چو	244
7	کتو صاحب	245
8	ہما	246
9	ماں	247
10	لوری	248
11	اصحاب فیل	250
12	تانڈو ناچ	254

مقدمہ

ابّا کے انتقال کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ کلیات کی اشاعت کا خیال اس لیے آیا کہ ان کے پہلے دو مجموعے 'کاغذی پیرہن' اور 'نیا عہد نامہ' دستیاب نہیں ہیں۔ 'کاغذی پیرہن' 1955 میں شائع ہوا، دوسرا مجموعۂ کلام 'نیا عہد نامہ' 1968 میں منظرِ عام پر آیا اور تیسرا اور آخری شعری مجموعۂ کلام 'زندگی اے زندگی' ان کے انتقال کے بعد 1983 میں شائع ہوا۔

ابا کو صرف ان کی تحریروں کے ذریعہ سے ہی میں نے جانا جس میں ان کی ڈائری، شعری مجموعے، تنقیدی مقالے، تبصرے اور صحافتی مضامین شامل ہیں۔ اپنے گھر کی لائبریری سے بھی ابا کے ذہنی نشو و نما کی نوعیت کا کچھ اندازہ ہوا۔ اِس دور کے تقریباً سب اہم رسائل، ہم عصروں کے مکاتیب، ترقی پسند ادب، کلاسیکی ادب کے شاہ کار، انگریزی اُدب اور مارکسزم اور کمیونزم سے متاثر ادب کی کتابوں کا ہماری لائبریری ایک خزانہ ہے۔ بہت سے طالب علم اور ریسرچ اسکالر آج تک استفادہ کرتے ہیں۔

اپنے گھر کی لائبریری میں بچوں کے ادب کی مجلد کتابیں، ایک عرصے تک مجھے ابا کے سوتے وقت اُن کتابوں سے پڑھ کر کہانی سنانے کی عادت کو یاد دلاتی رہیں اور مکمل طور پر ان کی غیر موجودگی کو محسوس کرنے کے بعد میں نے ان کتابوں کو پڑھنے کی کوشش میں اردو سیکھنا شروع کیا۔

تقریباً 39 سال کے اِس طویل عرصے میں میری ملاقات گاہے بہ گاہے ابا کے مختلف ہمعصر ادیبوں، شاعروں اور دوست احباب سے ہوئی۔ مجھے ابّا کی شخصیت اور مقبولیت کا اندازہ

انھیں لوگوں کے تاثرات سے ہوا۔ ان کی دانشوری، ذہانت، غیر معمولی قوتِ حافظہ، خلوص، مہمان نوازی، بے باکی اور ان کی پُر وقار شخصیت اور ہر دل عزیزی کے واقعات سے ان کے مکمل وجود کی تصویر میرے ذہن میں مرتب ہوئی۔

میں اپنے آپ کو غیر معمولی طور پر ہر اُس انسان کی طرف کھنچتا ہوا محسوس کرتی ہوں جو مجھے ابا کے بارے میں کچھ بھی معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی خلش اور جستجو ہے جو شاید ہی کبھی ختم ہو سکے۔ شہر یار چچا کے انتقال کے بعد شمیم چچا (شمیم حنفی) کی یادداشت کے خزانے سے کافی حد تک اس تلاش کی خلا میں رنگ بھرتے رہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ابا کو ان کے ہم عصروں، نقادوں، ادیبوں، دوستوں اور طالب علموں نے جس باریک بینی سے پڑھا ہوگا، میرا مطالعہ اس کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کلیات کے مرتب کرنے کی ذمہ داری کے ساتھ ساتھ اس کا دیباچہ لکھنے کی ذمہ داری بھی مجھے دی گئی۔ ابا کے بارے میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کی روشنی میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس فرض کو انجام دینے میں مجھے کس حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اس بات کا فیصلہ آپ قارئین کی رائے پر منحصر ہے۔

ابا کی شخصیت اور روزمرّہ کی زندگی کا اندازہ ان تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔
شہر یار 'آسماں اے آسماں' خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کے انتخاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:-

> "خلیل صاحب نے شعر و ادب کو کمبل کی طرح اوڑھا اور بچھایا تھا۔ ان کا ایک ایک لمحہ ادب اور تدریس کے لیے وقف تھا۔ زندگی سے بھی انھیں بہت پیار تھا۔ ایک عام انسان کی طرح ان میں کمزوریاں بھی تھیں۔ لیکن ان کمزوریوں کا اثر کبھی دوسرے پر نہیں پڑا۔ خود ترحمی سے انھیں نفرت تھی۔ عزتِ نفس کا جتنا اور جیسا خیال انھیں رہتا تھا میں نے کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ اپنی تعریف سے انھیں بھی خوشی ہوتی تھی لیکن اس کو حاصل کرنے کا نہ تو کوئی جتن کرتے تھے اور نہ ہی اپنی سطح سے اترتے تھے۔ دنیاوی ترقی سے تو نہ جانے انھیں نفرت ہی تھی۔ انھیں جو کچھ ملا ان کے نا چاہتے ہوئے ملا۔ جس ڈھب سے وہ دنیا سے گئے اس کی شان ہمیشہ سلامت رہے گی۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی وقعت، دوستانہ طبیعت، بے تکلفی، سادگی اور غیر معمولی معلومات اور حافظہ کا ذکر گوپی چند نارنگ نے اپنے مضمون 'کیا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور' جو انھوں نے اعظمی

صاحب کے انتقال پر لکھا اور اپنے احساسات کو ان تحریروں میں کچھ اس طرح پیش کیا:

"ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ بھی چند برس کے اندر اندر شائع ہو گیا۔ پھر 'نوائے ظفر' پھر 'مقدمہ کلام آتش' اور پھر 'اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک' اور یوں خلیل صاحب کا علمی قد روز بروز بڑھنے لگا۔ لیکن رندان باصفا اور دوستان بے ریا کو اتنا مطلب ان کے قد سے نہیں تھا جتنا اس انداز سے جو عبارت کا غزل میں ایک یاس انگیز ملگجی چاندنی میں دھیمی نرم رو لیتے والی کیفیت سے یا نظم میں افسردہ سلگتے ہوئے فکری تانے بانے سے اور تنقید میں کلاسیکی نظر کے فیضان، ادب کی ادبیت پر اصرار، معتدل اور متوازن اظہار رائے اور شبنم کی طرح شفاف اسلوب بیان سے، شاید یہی وہ کشش تھی جو ہم لوگوں میں اپنائیت اور یگانگت کے بے نام رشتے کی ضمانت تھی۔ بے تکلف گفتگو ہو، مباحثہ ہو، مذاکرہ ہو، سمینار، سمپوزیم اور جلسے کا منظر ہو، میں نے کبھی خلیل صاحب کو معلومات کے ہاتھوں بند نہیں دیکھا۔ کلاسیکی سرمایے کے علاوہ پچھلے چالیس برسوں کے ادبی رسائل کی بحثوں، معرکوں، مجادلوں اور مضامین و مقالوں سے متعلق معلومات کا وہ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ حافظہ اس بلا کا تھا کہ قدما سے لے کر عصر حاضر تک کے شعرا تک کے ہزاروں اشعار اور ملفوظات کے حوالے نوک زبان تھے۔ لیکن وہ اس کی نمائش نہیں کرتے تھے۔ دراصل وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو موقع بے موقع اپنے احساس کمتری کو سہلاتے رہتے ہیں۔"

محمود ہاشمی لکھتے ہیں:-

"خلیل صاحب خود اپنے لہجے کو بھی پروان چڑھا رہے تھے اور اپنے معاصرین کے لہجے پر بھی اثر انداز ہو رہے تھے۔ خلیل صاحب ہمارے لیے محترم بھی تھے اور بے تکلف دوست بھی۔ دلی اور مختلف شہروں سے یا پھر پاکستان سے، ادیبوں کے قافلے علی گڑھ پہنچتے اور خلیل صاحب سب کے لیے ناؤ نوش کا انتظام کرتے۔ اکثر شاعروں میں مختلف نظریۂ حیات رکھنے والے فنکار، ادبی مسائل پر اور صورت حال پر تبادلۂ خیال کرتے اور آخر میں خلیل صاحب ان کی رائے ان مسائل پر معلوم کرتے۔ خلیل صاحب کو کبھی غصہ نہیں آتا تھا۔ وہ ہمیشہ علمی استدلال کے ساتھ اپنی بات کہتے اور سب کو قائل کر دیتے تھے۔ شہریار کی

ادبی تربیت میں تو خلیل صاحب کا حصہ ہے ہی، انھوں نے بانی، سریندر پرکاش، کمار پاشی، شاذ تمکنت اور بہت سے دیگر فنکاروں کی ذہنی اور ادبی تربیت میں خاص حصہ لیا۔ ساقی فاروقی، اطہر نفیس اور اسد محمد خاں بھی خلیل صاحب کی شخصیت اور ادب سے بے حد متاثر رہتے ہیں۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کا آغاز نظم نگاری سے ہوا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے میں انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں لکھیں اور بعد میں علی گڑھ کے ادبی حلقے میں بھی ان کا تعارف ان کی نظموں کے حوالے سے ہوا۔ یہ ایک ترقی پسند معاشرہ تھا لیکن وہ اپنی ساری ترقی پسندی کے باوجود ہمیشہ شاعری میں نئے امکانات و مقامات کی جستجو میں سرگرداں رہے۔ ان کا ماننا تھا کہ بدلتے حالات میں ترقی پسندی یا جدیدیت سے مختلف نئے زاویوں اور تخلیقی رویوں کی ایجاد مسلسل ضروری ہے۔

ذاتی تجربات کو حال اور ماضی کے امتزاج سے ایک خوش گوار پیکر میں ڈھالنا انھوں نے اپنی تخلیقی کاوشوں کا مقصد بنالیا اور میر کی شاعری میں خود کو غرق کرلیا۔ ایک ادبی نقاد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے قدیم وجدید ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا۔ ایک صحافی اور ایک ہر دل عزیز مشفق استاد کی ذمے داری بھی بخوبی نبھائی۔ وہ ادب میں رونما ہونے والی بیشتر تبدیلیوں کا احاطہ کرتے۔ وہ بنیادی طور پر اپنی شاعری میں کلاسیکی مزاج رکھتے تھے۔ ان کی شاعری میں میر اور آتش کے لہجے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے قدیم عشق و محبت کی داستانوں کو بالکل نئے نقطۂ نظر سے بیان کیا:-

دنیا عجب جگہ ہے کہیں دل بہل نہ جائے
تجھ سے بھی دور آج تری آرزو گئی

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تجھ سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تجھے بھلا دیتے

خلیل الرحمٰن اعظمی کا پہلا مجموعۂ کلام 'کاغذی پیرہن' اس وقت منظر عام پر آیا جب ان کی عمر چھبیس ستائیس برس رہی ہوگی۔ اس مجموعے میں نظموں کو پہلے اور غزلوں کو بعد میں جگہ دی گئی ہے۔ 'کاغذی پیرہن' کی تیس نظمیں دو حصوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ 'نقشِ اول' اور دوسرا حصہ 'نئی فصل'۔

'نقشِ اوّل' میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی ذاتی زندگی کے اشارے ملتے ہیں۔ گھر کو چھوڑنے کا غم، گاؤں اور گھر والوں کی یاد، دوستوں سے بچھڑنے کا غم، ماں اور بہن کی یاد، تشنگی اور بے چینی، افسردگی کا شدت سے احساس، ان کی اس دور کی شاعری میں نمایاں طور پر واضح ہے۔ اپنا گھر، کھیت، دوست احباب، ماں کی شفقت سے محرومی کا احساس لفظوں کا جامہ پہن کر ان کی اس دور کی نظموں میں سرایت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

'میرا گھر میرا ویرانہ'، 'لوگ یاد'، 'آپ بیتی' اسی دور کی نظمیں ہیں۔ ان کو اس بات کی بھی فکر ہے کہ گاؤں میں لوگ انھیں بھی اتنی ہی شدت سے یاد کرتے ہیں یا نہیں جیسا کہ وہ خود ان کی یاد میں منہمک ہیں اور لوگوں پر تو انھیں شبہ بھی ہوسکتا ہے۔ مگر انھیں یقین ہے کہ ان کی ماں انھیں اتنی ہی شدت سے یاد کرتی ہیں اور ان کا انتظار کرتی ہوں گی۔

اب بھی دروازہ روز کھلتا ہے
راستہ میرا تک رہا ہے کوئی
میرے گھر کے اداس منظر پر
کوئی شے اب بھی مسکراتی ہے
مری ماں کے سفید آنچل کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں روتی ہیں
فاصلہ اور کتنی تنہائی
آج کٹتی نہیں ہیں یہ راتیں
آسماں مجھ پہ طنز کرتا ہے
چاند تاروں میں ہوتی ہیں باتیں
اے وطن تیرے مرغزاروں میں
میرے بچپن کے خواب رقصاں ہیں
مجھ سے چھٹ کر بھی وادیاں تیری
کیا اسی طرح سے غزلخواں ہیں؟

اس مجموعے کی بے حد مقبول نظم 'آپ بیتی' کے بارے میں محمود ہاشمی لکھتے ہیں:-

''اس نظم کا ابتدائی شعر۔

یوں تو مرنے کے لیے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لیے زہر پیا ہے میں نے

یہ شعر اور یہ نظم 1947 اور اس کے اطراف میں، جوان ہونے والی نسل کا بنیادی استعارہ ہے۔ خلیل صاحب کی ذات کا فسانہ جدید ذہن اور جدید نسل کی ذات کا فسانہ بن گیا۔ خلیل صاحب کے شعری مزاج میں اور ان کی تہذیبی سائیکی میں ایک گیرائی اور گہرائی تھی کہ ان کے تخلیقی مزاج کی آہستہ خرامی پوری نسل کا مزاج بن گئی۔ محسوس کیا جانے لگا کہ شعری تخلیق میں جس قدر تہہ نشیں شدت ہوگی، شعر کا تاثر اسی قدر افزوں ہوگا۔ بلند آہنگی ترقی پسند شاعری کا شیوہ تھا جس سے جوش و جذبہ تو پیدا ہوسکتا ہے، لیکن تہہ داری، مفاہیم کی علامتی کائنات دسترس میں نہیں آسکتی۔ یہی وہ کیف تھا جو خلیل صاحب کے اشعار میں مفاہیم کی تہہ داری کے ساتھ موجود تھا۔''

ایک قسم کی محرومی، انتشار، افسردگی کا عالم 'آپ بیتی' نظم میں اپنے عروج پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم میں خلیل صاحب نے اپنی زندگی کی مشکلات، مصائب، خارجی اور داخلی زندگی، گھر کا ماحول جس میں انھوں نے پرورش پائی، جسے وہ ابھی تک بھول نہیں پائے ہیں اور علی گڑھ آکر بھی ایک خلش بے نام ان کا پیچھا کرتی نظر آتی ہے جس میں بظاہر وہ سب سے بغاوت کر کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے خواب کو پورا کرنے علی گڑھ چلے تو آئے اور جو اپنے لیے بہتر تھا وہی کیا لیکن ان کا حساس دل اب بھی ماضی کی یادوں کا شکار ہے۔ اس نظم کے آخر میں 'ناتمام' درج کر کے انھوں نے اس بات کو واضح کیا کہ ماضی سے جوجھنے کا سلسلہ ابھی برقرار ہے اور ایک لامتناہی کیفیت رکھتا ہے۔

'کاغذی پیرہن' کے دوسرے حصے کی نظمیں بھی سوانحی عناصر اور انفرادی احساسات رکھتی ہیں۔ جیسے 'سفرنامہ'، 'شام وداع'، 'کنجِ محبت'، 'دوری' وغیرہ۔ ان نظموں میں بھی ان کی گزری ہوئی زندگی کے حالات، اپنے گھر سے آنے پر ان کی نفسیات پر گہرا اثر اور ایک غم زدہ ماحول کی عکاسی ملتی ہے۔

اس فہم و ادراک اور سوز و گداز کے امتزاج میں ان کی پوری شخصیت کی مصوری بخوبی ظاہر ہوتی ہے۔ ان نظموں میں عشقیہ رنگ کی نظمیں بھی شامل ہیں جو محبوب سے دوری کے احساس پر مبنی ہیں۔ نظم 'شام وداع' کی شروعات اس خیال کی نمائندگی کرتی ہے۔

اپنے ہاتھوں سے جلایا تھا جسے تم نے کبھی
اپنے ہاتھوں سے بجھا دو وہ محبت کے چراغ

ان کی اِس دور کی شاعری میں کلاسیکی شعرا کا اثر مکمل طور پر نظر آتا ہے۔ یہ عشقیہ شاعری بھی ذاتی احساسات کی پیداوار ہے۔ ہجر و وصال کا تضاد انھیں محو کیے ہوئے ہے۔ 'برہ کی ریکھا' اور 'جن راتوں میں نیند نہ آئے' میں ایک قسم کا انفرادی رنگ نمایاں ہے۔ اس نوع کی سب سے خوبصورت نظم 'کہانیاں' ہے، خوشگوار اور سادہ طرز بیان، اپنے وطن سے بے لوث محبت، اپنی سرزمین سے وابستگی، محبت کی ابتدا، انتہا، عروج و زوال کی بخوبی عکاسی اس نظم میں نظر آتی ہے۔ عشقیہ رنگ کے پس منظر میں ذاتی تجربات اور سوانحی عناصر یہاں بھی یکساں طور پر نمایاں ہیں۔

ان کی اِس مجموعے کی شاعری میں سیاسی رنگ کی جھلک بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اِس دور میں وہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ترقی پسند تحریک سے منسلک تھے اور ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے انجمن کے سکریٹری کے عہدے پر فائز تھے۔ نظم 'تذکرہ دہلی مرحوم کا' اور 'لہو کی زنجیر' اس قسم کی نظمیں ہیں۔ نظم 'تذکرہ دہلی مرحوم کا' 1947 میں لکھی گئی جب پورے ہندوستان میں خلفشار کا عالم تھا۔ نظم 'شامِ اودھ' بھی سیاسی نوعیت کی نظم ہے جو 1941 میں ڈسٹرکٹ جیل لکھنؤ میں لکھی جب ایک انتشار کے تحت پورے ہندوستان میں برہمی کا عالم تھا۔

چھبیس ستائیس سال کی عمر میں جب ان کا پہلا مجموعہ کلام 'کاغذی پیرہن' منظر عام پر آیا، انھوں نے زندگی کے بیشتر نشیب و فراز سے واقفیت حاصل کر لی تھی۔ 'کاغذی پیرہن' کے ابتدائیہ میں خود ان کی تحریر ہے:۔

> ''خلیل الرحمٰن اعظمی نام کا ایک شاعر اپنے نغمات کا پہلا مجموعہ شائع کر رہا ہے۔ وہ نئی نسل کا ایک بے پرواہ اور لااُبالی سا نوجوان ہے، لیکن اس کی یہ بے پروائی اور لاابالی پن دراصل اپنے اُن زخموں کو چھپانے کی ایک ناکام کوشش ہے جو اس کے سینے میں جلتے رہتے ہیں۔ اس کی عمر بس چھبیس ستائیس سال ہوگی مگر کوئی اس سے پوچھتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا کرو گے پوچھ کر؟ میرے ہر سال میں کئی کئی عمریں چھپی ہوئی ہیں۔ میں اپنی زندگی میں کئی بار مر چکا ہوں، نوجوان ورتھر کی طرح میں نے بھی خودکشی کی ہے، رام چندر کی طرح بن باس لیا ہے اور میرے ایودھیا کی ہوائیں مجھ سے لپٹ لپٹ کر روتی ہیں۔ یوسف کی طرح زنداں میں ڈال دیا گیا ہوں اور میرے گھر کی دیواریں میری راہ تکتے تکتے

اندھی ہوگئی ہیں۔ میرا دامن بارہا چاک ہو چکا ہے۔ مسیح کی طرح مجھے بھی صلیب پر لٹکایا گیا ہے اور دیوداس کی طرح ناکامی کے زہر کا پیالہ پینا پڑا ہے۔''

'کاغذی پیرہن' کی 28 غزلوں میں گاہے بہ گاہے ترقی پسندی کے اثرات کا اندازہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندی کے زیرِ اثر ان کی غزل جس کی ردیف 'صیاد' ہے، اس بات کی وضاحت کرتی ہے اور اس میں ترقی پسندی کے اصولوں اور مروجہ روایت کی پیروی کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔

کیسی یہ رسم ہے یہ کیسا چلن ہے صیاد
آج بھی سر پہ وہی چرخِ کہن ہے صیاد
ٹوٹ کر پاؤں کی زنجیر گری جاتی ہے
اک نئے رقص میں اب سارا چمن ہے صیاد

سیاسی اور سماجی شعور کے ساتھ ساتھ، اس مجموعے میں ترقی پسندی اور رومانی عناصر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ فیض کی طرح ان کا بھی یہی ماننا تھا کہ براہِ راست سیاسی مسائل کا شاعری میں حل تلاش کرنا مناسب نہیں ہے۔ اس میں شاعری کے لطیف و نازک پیرائے میں، استعارات تشبیہات کے ذریعے ہی اپنے خیالات کی عکاسی ایک دیرپا اور موثر کیفیت کی حامل ہو سکتی ہے۔ شگفتہ و شاداب لہجہ اس کاوش میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی اس دور کی غزلوں میں ہجرت کا موضوع نمایاں ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری:—

''ان غزلوں میں جو رچا ہوا غم ہے، گھائل زخموں کے جو نشتر ہیں، جو خلش اور کسک ہے، جو سپردگی اور معصومیت ہے اور اس کے ساتھ جو ضبط اور توازن ہے، وہ کامیاب حزنیہ شاعری کے ماتھے کا جھومر ہے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اعظمی صاحب کی نظموں میں جو واردات تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان کی روح ان غزلوں میں کھنچ آئی ہے اور اسی لیے ان میں رمزیت اور غنائیت کے جوہر چمک اٹھے ہیں۔''

اس مجموعے کی شاعری ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مشتمل ہے۔ اس میں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی کشمکش، رسوم و عقائد سے انحراف اور حساس طبیعت کے زیرِ اثر ان کی مشکل شخصیت پر گہرے اثرات، لطیف و نازک الفاظ میں ایک باہمی ربط و ضبط کے ساتھ پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔

'کاغذی پیرہن' کے تقریباً دس سال کے طویل عرصے کے بعد 'نیا عہد نامہ' منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے کے نام اور ترتیب دونوں سے ایک نئے مزاج کی تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اس میں غزلوں کو اولیت دی گئی ہے۔ ان غزلوں میں ان کے مشاہدات و تجربات، غور و فکر کے زاویہ اور احساسات کا محور کچھ خوشگوار فضا لیے ہوئے سامنے آیا ہے۔

'نیا عہد نامہ' کے دیباچے میں پہلی بار ترقی پسندی سے اپنی مایوسی کا اظہار کیا اور اسی وجہ سے اس مجموعے پر ترقی پسند حضرات نے کھل کر تنقید کی کہ یہ شاعری ترقی پسند شاعری کے مزاج سے مختلف ہے۔

وہ ترقی پسندی سے جدیدیت کے سفر پر گامزن ہیں اس بات کا اندازہ ہمیں مجموعے کے عنوان سے بھی ہو جاتا ہے جس میں وہ کچھ نئے خوشگوار عہد و پیمان کے زیر اثر اپنی تخلیق کا آغاز کرتے ہیں۔ 'نیا عہد نامہ' میں ایک نئی دلکشی، محبت، امید، بصیرت، حکمت اور حسن کے احساسات ایک منفرد اور خوشگوار فضا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں خودکلامی اور بیانیہ انداز واضح ہے۔ نظم 'اپنے بچے کے نام'، 'قیدی' اور 'تنہائی سے آگے' اسی انداز کی نظمیں ہیں۔ ان کی نظم 'قیدی' میں ذہنی الجھنوں، پریشانیوں اور گھٹن کا احساس شدت سے نمایاں ہے، لیکن وہ قید و بند کی زندگی سے مایوس نظر نہیں آتے ہیں جیسا کہ نظم 'تنہائی سے آگے' میں یہ امید کی شمع جگمگاتی نظر آتی ہے۔

ان خلاؤں سے نکل کر کہیں پرواز کریں
آؤ کچھ سیر کریں ذہن کی پنہائی میں
کیوں نہ دریافت کریں ایسی گزرگاہوں کو
بات کرتی ہیں مسافر سے جو تنہائی میں

'نیا عہد نامہ' کی نظموں میں خارجی اور داخلی احساسات کا ٹکراؤ دیکھا جا سکتا ہے۔ ان نظموں میں ایک جیتی جاگتی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ وہ خیال کی وسعت اور خوب صورتی کے ساتھ ساتھ، الفاظ و لہجہ کی افادیت کا بھی پورا خیال رکھتے ہیں جو ذہن پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ اس مجموعے کی نظمیں 'سایۂ دیوار'، 'دوسری ملاقات' وغیرہ میں ذہنی کشمکش کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ نظم 'بن باس' بھی اسی ذہنی کرب اور تناؤ کی عکاسی کرتی ہے۔ اس دور کی رومانی نظموں میں ایک دھندلی فضا نظر آتی ہے۔ 'نیا عہد نامہ' کی غزلیں اور نظمیں دونوں نئے رجحانات سے روشناس کراتی ہیں جو کہ ان غزلوں اور نظموں کے اثرات کو دیرپا کر دیتے ہیں۔

نسیم شہوی اعظمی صاحب کو 'نیا عہد نامہ' کے پیکر میں کچھ اس طرح دیکھتے ہیں:—

''نیا عہد نامہ ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ اسے خلیل الرحمٰن اعظمی کے فن کی معراج کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا اس دور میں اردو شاعری میں نیا ذہن ابھر رہا تھا۔ لوگ روایتی شاعری سے اپنا دامن چھڑا کر اسلوب و ہیئت کے نئے تجربے کر رہے تھے۔ شاعری کو عام انسانوں کے مختلف قسم کے جذبات و احساسات سے ہم آہنگ کرنے کا رواج عام ہو رہا تھا۔ جدید تحریک سے خلیل الرحمٰن اعظمی بھی قریب آئے۔ ان کی یہ وابستگی جذباتی نہیں بلکہ ان کے رجحان کی وجہ سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس تحریک سے گہری دلچسپی دکھائی اور اسے آگے بڑھانے میں سرگرم رہے۔''

انھوں نے اپنی نظموں میں ہندی کے الفاظ کا بھی استعمال کیا ہے۔ روزمرہ کی ہندی زبان کے الفاظ کو شعری پیکر میں ڈھال کر ایک نئے قسم کی تخلیق کا آغاز انھوں نے اپنی شاعری میں کیا۔ 'نیا عہد نامہ' کی غزلوں میں ایک خوشگوار کیفیت، ایک مکمل اطمینان بخش زندگی کا عکس ان کی شعری تخلیقات پر پوری طرح واضح ہے۔ حالانکہ اس پر امید ربط و ضبط کی زندگی جو ان کو بظاہر اب حاصل ہے، اس میں بھی تخلیق کار کا ذہن اور حساس مزاج ہونے کے باعث وہ خود کو پوری طرح پرسکون نہیں محسوس کر پا رہے ہیں اور ان کا یہ ذہنی انتشار یہاں بھی سوز و گداز کے پیرایہ میں غزلوں کا خاصہ ہے۔

خلیل صاحب کی اس دور کی شاعری میں ایک خوشگوار ازدواجی زندگی کی جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ نظم 'آنچل کی چھاؤں' اور 'اپنے بچے کے نام' جو کہ ایک بے حد شفقت آمیز انداز کی نظم ہے جو کہ انھوں نے اپنے بڑے بیٹے کامران کے لیے لکھی۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

اے مقدس زمیں کے شعلۂ نو
تو فروزاں ہو اُن فضاؤں میں
میرے سینے کی جو امانت ہیں
جو میری نارسا دعاؤں میں
اس طرح مسکراتی ہیں جیسے
نغمگی دور کی صداؤں میں

مجھ کو اجداد سے وراثت میں
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا
عمر بھر پائمال و خاک بسر
میرا حصہ رہا غمِ فردا
مجھ کو میرے لہو میں نہلا کر
جس نے قیدِ حیات میں رکھا
اے مری روحِ فن کے عکسِ جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہو سکا وہ تو ہو جائے
کاش تو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
ان دیاروں میں تیرا نام چلے

اس دور میں ان کا لاابالی پن، ایک ذمے دار شخصیت اختیار کر چکا تھا اور گھر کی پرسکون فضا ان کی زندگی کا محور تھی جس میں وہ اپنی تخلیقی کارروائی کو بھی دل جمعی کے ساتھ انجام دے رہے تھے۔ ان کی بیگم راشدہ خلیل کا بیان ہے:-

''میری شادی جب ہوئی تو گھر میں اس وقت شہر یار رہتے تھے جنھیں میں اور خلیل صاحب، کنور صاحب کہتے تھے اور دوستوں میں شہاب جعفری، حسن ثنیٰ انور، وقار جعفری، انور معظم اور شاہد مہدی کا برابر آنا جانا رہتا تھا۔ محمود ہاشمی اکثر دہلی سے آتے رہتے تھے اور بھی احباب تھے، روز آنہ دعوتیں ہوتیں۔ سنیما جانے کا پروگرام ہوتا۔ سمجھ لیجیے سب کا دن رات کا ساتھ تھا۔ خلیل صاحب دوستوں میں ہمیشہ خوش رہتے تھے۔ ہندوستان، پاکستان کا شاید ہی کوئی ایسا ادیب ہوگا جو علی گڑھ آیا ہو اور ہمارے گھر نہ پہنچا ہو۔ آنند نرائن ملا، فراق گورکھپوری، مجنوں صاحب، اختر اورینوی، شکیلہ اختر، امتیاز علی عرشی، گیان چند جین، شکیل بدایونی، نریش کمار شاد، جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری، اختر الایمان، عصمت چغتائی، گوپال متل، کیفی اعظمی، کرشن موہن، راہی معصوم رضا، بلراج کومل، سلمیٰ صدیقی، شاذ تمکنت، زبیر رضوی، کلام حیدری، جیلانی بانو، گوپی چند

نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ۔“

’نیا عہد نامہ‘ کی شاعری میں ترقی پسندی سے انحراف وانکار کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے جو ان کے مزاج میں رونما ہونے والی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ان کی اس دور کی شاعری میں ذاتی تجربات اور آپ بیتی کی کیفیات کا احساس کچھ کم ہے اور فنی مہارت، استعارات، تشبیہات سے ان کے فکر وفن کی گہری سطحوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن میری دہلیز پر اتار مجھے

’نیا عہد نامہ‘ کی غزلیں داخلیت وخارجیت سے پرے ایک نئے ذہن کی نشو ونما کا پتہ دیتی ہیں، جن میں کلاسیکی ذہن، بے حد نمایاں ہے۔ اس نوع کی غزلوں میں ہمیں ان کی شاعری پر میر کا گہرا اثر نظر آتا ہے، جیسا کہ وہ خود نیا عہد نامہ کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

”انھیں دنوں کلیات میر کے مطالعے کے دوران مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری داخلی دنیا میں کچھ دریچے کھل گئے ہیں، جن سے ہو کر ایسی ہوائیں آرہی ہیں جو مجھے محبت ورفاقت، خلوص وہمدردی اور دل کی دل آسائی کا پیغام دے رہی ہیں۔“

خلیل الرحمٰن اعظمی نے میر کی زندگی کے حالات اور ان کی تنہائی کو اپنے حالات زندگی سے ملتا جلتا پایا، انھوں نے میر سے اپنی زندگی میں جو سبق حاصل کیا وہ پریشانیوں سے شکست نہ ماننے کا عہد تھا۔ انھوں نے میر کو بالکل دوسرے زاویے سے دیکھا جو کہ روایتی انداز کے سوز وگداز کی عکاسی کرتے ہوئے میر سے نہایت مختلف وجدا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”میر کی آواز کو روایتی آواز سمجھنا میرے لیے محض غزل گوئی یا شاعری کا راستہ نہیں تھا، بلکہ یہ میری پوری زندگی کا مسئلہ تھا۔ اس آواز کا سراغ مجھے نہ ملتا تو میری روح کا غم جو اندر ہی اندر مجھے کھائے جارہا تھا، نہ جانے مجھے کن اندھی گلیوں کی طرف لے جاتا۔“

ان کی اِس دور کی شاعری پر میر کے اس واضح اثر کو کئی ادیبوں اور نقادوں نے محسوس کیا اور اس کے بارے میں لکھا۔ مثلاً وحید اختر، ممتاز حسین، سید وقار حسین، احمد محفوظ، تجمل حسین، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ۔ ممتاز حسین لکھتے ہیں:

”خلیل صاحب کی شاعری میں کچھ اور رنگوں کی بھی آمیزش ہے۔ ان میں میر

زیادہ اور فراق کم نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں میر کے تغزل کا احیا ولب ولہجہ
پرسوز وگداز کی اہمیت کو ماننے کے سبب پیدا ہوا۔ اسی صورت میں میر ایک ہم
عصر رجحان بن گئے ہیں۔ بشرطیکہ ہم چند متروک الفاظ سے اپنی میریت کو ظاہر
کرنا نہ چاہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں میر کی تقلید میریت ظاہر کرنے کے
لیے نہیں، بلکہ ایک ہم عصر رجحان کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔''

مختلف ادیبوں اور نقادوں کے مطابق خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری میں میر کی آہستہ کلامی کا اثر مکمل طور پر ملتا ہے، لیکن وہ کہیں کہیں میر سے بالکل مختلف نظر آتے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مضمون 'خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل' میں لکھا:

''انھوں نے اسلوب وفکر کی سطح پر میرؔ سے کوئی خاص براہِ راست اکتساب نہیں
کیا'' ان کا ماننا ہے کہ'' حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو طرزِ میر کا شاعر کہنا ان کی
انفرادیت کے ساتھ ناانصافی اور خود میر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ خلیل الرحمٰن
اعظمی کی شاعری میں میرؔ کا حصہ ہے، لیکن بہت چھوٹا سا۔ ان کی بہترین غزلوں
کو کسی دوسرے شاعر کے سیاق وسباق میں رکھ کر پڑھنا مناسب نہیں۔''

یہ کہنا درست ہوگا کہ میر سے انھیں شعر گوئی میں ذاتی تجربات کے اظہار کا حوصلہ ملتا ہے۔ ترقی پسندی سے منسلک ہونے کے نتیجے میں جو اثرات ان کے اس دور کی ابتدائی شاعری میں جو کہ ایک قسم کی پابندی کا عنصر لیے ہوئے تھی، دکھنا شروع ہوگئے تھے۔ وہ میر کی ہی بدولت اس سے بھی نجات حاصل کر سکے۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ میرؔ نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو ترقی پسندوں کے ہاتھ سے خرید
کر آزاد کرادیا پھر انھوں نے اپنی شخصیت خود دریافت کر لی۔''

خلیل صاحب کی شاعری میں ایک نرم روی، آہستہ کلامی اور ٹھہراؤ ہے۔ ایک سرگوشی کا انداز جو خوبصورت تشبیہات واستعارات کے ذریعہ ان کے اندرونی احساسات کو پیش کرتا ہے۔

سوئی ہے کلی دِل کی اس کو بھی جگا جانا
اس راہ سے بھی ہوکر اے بادِ صبا جانا
ہم بھولتے جاتے ہیں اس چہرۂ زیبا کو
اے خواب ذرا اس کی صورت تو دکھا جانا
جب موسمِ گل آئے اے نکہتِ آوارہ

آ کر درِ زنداں کی زنجیر ہلا جانا
پھر ہاتھ چھڑاتی ہے مجھ سے میری تنہائی
پھر دل کے سنبھلنے کے انداز بتا جانا
کس ناز سے پالا ہے ہم نے غمِ ہجراں کو
اس غم کو ذرا آکر سینے سے لگا جانا
اوروں کے لیے یوں تو ایک سنگ گراں ہم ہیں
ہاں تم بھی کبھی چاہو مٹی میں ملا جانا
آنکھوں سے بھی اب دل کی روداد نہیں کہتے
اب ہم سے کوئی سیکھے ہر بھید چھپا جانا
اپنے ہی خرابے میں ہم عمر گزاریں گے
جب تم کو ملے فرصت یہ گھر بھی بسا جانا

خلیل الرحمٰن اعظمی کے آخری شعری مجموعے 'زندگی اے زندگی' کی زیادہ تر شاعری ان کی زندگی کے آخری دور کا سرمایہ ہے جس میں غزلوں کی تعداد 40 اور نظموں کی تعداد کل 15 ہے۔ اس مجموعے میں نظمیں، غزلیں، نعتیں، کتبات اور گیت بھی شامل ہیں۔

اس مجموعے میں جو کہ ان کے انتقال کے تقریباً پانچ سال بعد 1985 میں شائع ہوا، زندگی اور موت کے اضطراب کا حال، ماضی اور مستقبل کی کشمکش، ذاتی تجربات کی تلخیاں اور ان سے اوپر اٹھ کر ایک قسم کا وقار، عرفان و ادراک حاصل کرنے کی مسلسل کوشش نمایاں ہے اور ان کی اس آخری دور کی شاعری میں کسی اور شاعر کا اثر مشکل سے دکھائی پڑتا ہے۔

بس اتنی بات تھی کہ عیادت کو آئے لوگ
دل کے ہر ایک زخم کا ٹانکا ادھڑ گیا
ہم بانسری پہ موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی، اے زندگی، رتبہ رہے بالا ترا
درمیاں خود اپنی ہستی ہو تو ہم بھی کیا کریں
آئینہ دیکھیں کہ اپنے آپ سے پردہ کریں
ایک دو پل ہی رہے گا سب کے چہروں کا طلسم
کوئی ایسا ہو کہ جس کو دیر تک دیکھا کریں

'نیا عہد نامہ' کی طرح 'زندگی اے زندگی' میں بھی ان کی کچھ نظموں پر جدیدیت کا اثر واضح

ہے۔ جیسا کہ 'نیا آدمی'، 'میں گوتم نہیں ہوں' جیسی نظموں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 'مٹی کا گیت' جیسی نظمیں نئی حسیت اور شاعری کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ایک پرچھائیں، اپنا عکس یا ایک دوسری ہستی کا احساس ان کی اس دور کی شاعری میں بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے جو جدیدیت کی نشاندہی کراتا ہے۔

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس آخری دور کی نظمیں اپنی گھریلو زندگی سے متعلق، اپنی بیماری کے احساس، زندگی کی پیچیدگیوں سے فرار تو کبھی ان کو گلے لگانے کی متضاد کیفیت سے بھرپور ہیں۔ اس دور کی نظموں میں طنزیہ لہجے کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ جیسے کہ نظم 'ان کہی'۔

اس مجموعے کی نظم 'مٹی کا گیت' شاعر کی انفرادیت اور جدیدیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس نظم میں زندگی کی بے ثباتی، رشتوں کی ناپائیداری اور زندگی سے فرار حاصل کرنے کا عنصر بظاہر نمایاں ہے، لیکن دراصل یہ نظم زندگی کو اس کی حقیقتوں کے ساتھ جینے کا پیغام بھی دیتی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے زندگی کے مختلف کھیلوں کو اجاگر کیا ہے جیسے کہ سیاست کا کھیل، مذہب اور دولت کا کھیل، انا اور طاقت کا کھیل اور انسان کی کم عقلی کہ وہ ان سب پیچیدہ کھیلوں میں اپنے کو ملوث کرتا ہے اور خود ہی اس کا شکار بنتا ہے، جبکہ اس کی حقیقت آخر میں صرف فنا ہو جانا ہے۔

ان کی نظر میں مٹی کی آغوش میں پناہ لینا ہی ایک اٹل حقیقت ہے جس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

مٹی کی چادر میں چھپیں گے، قبر بنے گی مٹی کی
سب مٹی میں مل جائیں گے، ختم فسانے مٹی کے

نظم 'مٹی کا گیت' کے بارے میں شمیم حنفی لکھتے ہیں:

''یہ نظم میں نے آدھی رات کے بعد بہت سناٹے میں خود خلیل صاحب کی زبان سے سنی اور انھیں سنتے وقت ایک ایسے تجربے سے گزرا ہوں جس نے آنکھوں کے سامنے ایک رمز آمیز، غیر حقیقی، قدرے مجنونانہ رقص کے منظر بکھیر دیے تھے۔ بظاہر یہ رقص موت کا تھا اور موت کی بانسری کے سروں پر اس کے تحرک اور رفتار کی گت لحہ بہ لحہ تیز تر شدید تر اور دیوانہ وار ہوتی جاتی تھی۔ لیکن میں نے اسے خلیل صاحب کی توانا بھاری اور مستحکم آواز میں زندگی کے ایک شدید آخری رقص کی مثال دیکھا اور دل بہت تنگ ہوا۔ یوں محسوس ہوا کہ یہ نظم زندگی اور

موت کے آخری سفر کی ناچ کتھا ہے اور کتھا میں رچی ہوئی روح کا اضطراب،
حروف و اصوات کی ہر تھاپ کے ساتھ، ایک لازوال مہیب اور بے کراں الم
میں ڈھلتا جاتا ہے۔ الم جو جاوداں ہے اور زندگی کی بنیادی، پہلی اور آخری
سچائی ہے۔''

اس مجموعے کی ایک اور اہم نظم 'میں گوتم نہیں ہوں' ہے۔ یہ نظم بھی جدیدیت کے اثرات کی نمائندگی کرتی ہے، اور اس نظم میں ایک قدیم تاریخی شخصیت کے حوالے سے اپنے سوانحی عناصر کو ایک مخصوص طرزِ بیان میں ڈھال کر بیان کیا گیا ہے۔ 'زندگی اے زندگی' کی کچھ نظموں میں ان کی آسودہ حال زندگی اور اطمینان بخش گھر کی فضا کی عکاسی ملتی ہے جیسے نظم 'کمو صاحب'، 'ماں'، 'اٹو پچو'، 'لوری'، 'ہما' سادہ الفاظ میں لکھی ہوئی نظمیں ہیں جن سے ان کے گھریلو لگاؤ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس مجموعے کی نظم 'اصحابِ فیل' ایک صوفیانہ لہجہ اور قرآنی واقعہ پر مبنی ہے۔

اعظمی صاحب کی شاعری میں روایتی عشق و محبت اور رومانی جذبات کے بجائے ایک ٹھہراؤ، ذاتی تجربات و مشاہدات، جو وقت کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، ان کو بیان کرنے کا ایک منفرد لہجہ پایا جاتا ہے۔ بقول اسلوب احمد انصاری کے ''یہ عشق و محبت کے عارضی خزانے ہیں۔''

خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری ان کی ذات کا فسانہ ہے جو انھوں نے بے حد صاف گوئی اور دلکش بیانی، نفاست و خوب صورتی کے پیرایے میں اپنی نظموں اور غزلوں میں پیوست کیا ہے۔ بقول سید وقار حسین ''ان کی شاعری اس قدر شفاف اور اپنے آپ میں اتنی مکمل ہے کہ وہ کسی حوالے سے پڑھی جانے کی محتاج نہیں ہے۔''

'زندگی اے زندگی' کی غزلوں میں ایک شکایتی اور ڈھکا چھپا انداز اختیار کرنے کے بجائے، انھوں نے صاف بیانی اور بے باکانہ انداز اختیار کیا ہے۔ اس میں معاشرہ پر طنز اور ان کی ذاتی زندگی کی کچھ الجھنوں کا احساس بھی ان کی اس دور کی شاعری میں نظر آتا ہے۔

سگِ آوارہ سے بدتر یہ سگِ دنیا ہے
ورنہ سوچا تھا کہ دونوں کو برابر باندھوں

ہم کیا بتائیں اپنے حریفوں کا حالِ زار
صورت بگڑ گئی ہوسِ انتقام میں

لوگ ہم جیسے تھے اور ہم سے خدا بن کے ملے
ہم وہ کافر ہیں کہ ہم سے کہیں سجدہ نہ ہوا

روایت سے انحراف، بے اہل لوگوں کی ترقی پر طنز، تلخ تجربات سے ہمکنار ہونا، اور اپنے فطری مزاج کو ہر بدلتے ماحول میں برقرار رکھنا، ان کی آخری دور کی شاعری تک قائم رہا۔

یاں تو سب لوگ ہیں دستارِ فضیلت باندھے
کوئی ہم سا ہو تو اس بزم میں ہم بھی بیٹھیں

ہمیں تو راس نہ آئی کسی کی محفل بھی
کوئی خدا کوئی ہمسایۂ خدا نکلا

مہتاب حیدر نقوی اپنے مقالے میں لکھتے ہیں ''عشق کے لطیف ترین احساس اور اس کی جہات کو جس قدر خلیل الرحمٰن اعظمی نے محسوس کیا، تجربہ کی سطح پر اس کی مثال اس سے پہلے مشکل سے ہی ملے گی۔ 1940 کے بعد آنے والی نسل نے اس رویہ کو شاعری کے غالب رجحان کے بطور قبول کیا۔ شہریار، ساقی فاروقی، اور دوسرے جدید شعرا کے یہاں اس قسم کی مثالیں مل جائیں گی۔ مگر اس کا نقطۂ آغاز خلیل الرحمٰن اعظمی کو ہی سمجھنا چاہیے۔''

یوں جی بہل گیا ہے تری یاد سے مگر
تیرا خیال تیرے برابر نہ ہوسکا

کتنی عجیب شے ہے مگر خواہشِ وصال
جو تیری ہو کے بھی نہ مرے روبرو گئی

تمام عمر اسی پیچ و تاب میں گزری
کہ آسماں کو ترے پاؤں پر جھکا دیتے

کھڑکیاں جاگتی آنکھوں کی کھلی رہنے دو
دل میں مہتاب اترتا ہے اسی زینے سے

ان کے اس آخری دور کی شاعری میں تجربات کا ٹھہراؤ ہے، لہجہ اور خیالات وتصورات سب

کی رفتار ایک میانہ روی اختیار کیے ہوئے ہے جو ایک عمر اور وقار کے ساتھ کسی بھی ذات کا حصہ بنتی ہے۔ یہ لہجہ ان کے پہلے اور دوسرے دور کی شاعری سے مختلف ہے۔

مہتاب حیدر نقوی لکھتے ہیں:

''ایک ممتاز نقاد کی حیثیت سے ماضی کے سرمایۂ ادب کی چھان بین کرنا خلیل الرحمٰن اعظمی کا شیوہ رہا ہے۔ اسی چھان بین کے دوران میر اور آتش کے کلام سے ان کا سابقہ پڑتا ہے۔ میر کے سوز و گداز اور نرم گفتاری اور آتش کے طنزیہ لہجہ نے اعظمی صاحب کو بہت متاثر کیا۔ ایسے میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا ایک مشکل کام تھا مگر کلاسیکی نظم و ضبط کے حامل اور عصری حقائق پر گہری نظر رکھنے والے اس شاعر نے ماضی کے انھیں شعرا کی شاعری سے ایک ایسی 'لے' کو دریافت کرلیا جو اس عہد کے طرزِ احساس کے اظہار اور اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے میں معاون ثابت ہوئی۔''

سید وقار حسین 'زندگی اے زندگی' کی غزلوں کو کچھ اس پیرائے میں دیکھتے ہیں:

''کاغذی پیرہن' اور 'نیا عہد نامہ' کے مقابلے میں اس عہد میں خلیل الرحمٰن اعظمی شعرگوئی کے اس درجۂ کمال پر پہنچ گئے ہیں جہاں شعرگوئی کے لیے شعوری کاوشوں کی ضرورت بے معنی ہو جاتی ہے یعنی یہاں ان کی شاعری، آرائش، سنسنی خیزی اور ہنگامی مسائل سے پاک و صاف سادگی اور پختہ کاری کی بہترین مثال پیش کرتی ہے، کیونکہ اب ان کے نزدیک یہ بات ناپسندیدہ تھی کہ محض فنی شعبدہ بازی دکھا کر داد وصول کی جائے۔''

'زندگی اے زندگی' کی نظمیں اور غزلیں ہمیں زندگی کے تجربات و مشاہدات سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ ایک پیغام اور سبق دینے سے گریز کرتی ہیں اور ایک واعظانہ انداز اختیار کرنے سے پرہیز کرتی ہیں۔ یہ شاعری خالص شاعری سے لطف اندوزی پر اصرار کرتی ہے۔ ایک وسیع اور منفرد نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتی ہے جہاں نظریات، رجحانات کی اہمیت مرکزیت کا حامل نہیں ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

''اپنے عہد میں مزاجِ شاعری کے بدلنے والے Process میں شریک ہونا

بجائے خود بڑی سعادت ہے اور یہ ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی۔ اگر دو یا تین
بڑے نام لیے جائیں گے تو 1950 کے بعد کی غزلیہ شاعری میں خلیل صاحب کا
نام یقیناً آئے گا۔"

خلیل الرحمٰن اعظمی نے میر، آتش، مومن، ظفر، ذوق اور فراق سے اپنے شاعرانہ مزاج کی مطابقت کو زیادہ قریب محسوس کیا۔ انھوں نے فطری ذہنی، جذباتی، جمالیاتی، ذاتی مشاہدات اور روزمرہ کی زندگی کے پورے زاویہ کو اپنے شعری پیکر میں ڈھالا۔

ہم پہ جو گزری ہے بس اس کو رقم کرتے ہیں
آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو

یہ ابا کی تخلیقات کا تجزیہ نہیں ہے۔ بس کچھ تاثرات کا بیان ہے۔ میرے ذہن میں ان کی تصویر، زمانی فاصلے کے باعث، بہت دھندلی سی ہے۔ میں نے ان کی شاعری اور نثر پڑھی تو اس تصویر کے نقش کسی قدر روشن محسوس ہوئے۔ میں نے اس خام اور ادھوری تصویر میں بس اسی نقش کو محسور کرنے کی کوشش کی ہے — ایک نارسا اور ناتمام کوشش!

•

ہما مرزا
نئی دہلی

خلیل الرحمٰن اعظمی، گذشتگاں سے آئندگاں تک

بڑی خوشی کی بات ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی کا کلیات شعر شائع ہو رہا ہے اور اس کی ترتیب و تدوین خلیل صاحب کی لائق بیٹی ہما سلمہا نے کی ہے۔ امید ہے کہ خلیل صاحب کا کلیات نثر بھی جلد شائع ہوگا۔

خلیل الرحمن اعظمی سے میرا رشتہ صرف ہم وطنی کا نہیں، ہم خیالی کا بھی ہے اور اس میں استفادہ بھی شامل ہے۔ یعنی خلیل الرحمن اعظمی کے ساتھ گفتگوؤں نے مجھے جدید ادب کے بارے میں بہت کچھ سکھایا اور ان کی تنقیدی تحریروں نے میرے سامنے غور و فکر کے امکانات روشن کیے۔ بطور شاعر ان کی شہرت نے لوگوں کو ان کی نثر کے محاسن کی طرف متوجہ ہونے کا خیال نہ لائی، ورنہ وہ اپنے زمانے کے بہترین نثر نگاروں میں شمار ہوتے۔ یہ خیال رہے کہ جب خلیل الرحمن اعظمی نے لکھنا شروع کیا اس وقت خورشید الاسلام کی نثر کا بہت چرچا تھا۔ شبلی، حالی اور امراؤ جان ادا پر ان کے مضامین کو خوبصورت لیکن عموی اور بڑی حد تک غیر تنقیدی لیکن دل کو متاثر کرنے والی تنقید کا نمونہ کہا جانا چاہیے۔ لیکن اس وقت ان کے تنقیدی اسلوب کو اعلیٰ درجے کا تنقیدی اسلوب سمجھا گیا:

> ''شبلی نے شاید کبھی شراب نہیں پی لیکن ان کی تحریروں میں شراب کا رنگ جھلکتا ہے اور ان میں ہلکا سا نشہ بھی ہے۔''

اس قسم کے جملوں میں کوئی معنی نہیں، کوئی استدلال نہیں، صرف تاثرات ہیں۔ لیکن خلیل الرحمن اعظمی کے زمانۂ نوجوانی میں اس طرح کی تنقید (اگر اسے تنقید کہا جا سکتا ہے) بہت مستحسن نگاہ سے

دیکھی جاتی تھی۔ اس کے برخلاف، بہادر شاہ ظفر پر خلیل الرحمٰن اعظمی کے مضمون میں کوئی عمومی بات، کوئی تاثراتی فیصلہ، کوئی ابہام نہیں۔ بلکہ یہاں بعض باتیں ایسی ہیں جن سے اس وقت کی اردو تنقید اس وقت آشنا نہ تھی:

''ظفر نے اپنی شاعری کے اس حصے میں چند الفاظ اور اشارات کو خاص طور پر استعمال کیا ہے جس سے ان کے مزاج اور ان کی شخصیت کے بنیادی عناصر کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ وہ الفاظ ہیں: شمع، آنسو، آگ، فلک کا جل جانا، شراب کی گرمی... دامنِ صحرا میں آگ کا لگ جانا، بھڑکے ہوئے چراغ کی لو... یہ الفاظ جب اشعار میں آتے ہیں تو ظفر شاہ نصیر اور ذوق کی بزمِ سخن سے نکل کر ایک اور دنیا میں آ جاتے ہیں۔''

یہاں کسی عبارت آرائی، جملہ تراشی، عمومیت کا دخل نہیں۔ بات بالکل واضح ہے، کسی قسم کی غلط فہمی یا معنی کی تلاش میں سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں۔ خیال میں رہے کہ کسی شاعر کے یہاں کلیدی فقروں یا الفاظ یا پیکروں کی نشاندہی اس زمانے میں بالکل نیا تنقیدی رویہ تھا۔ ملحوظ رہے کہ ظفر پر مضمون 1952 کا لکھا ہوا ہے، جب خلیل الرحمٰن اعظمی کی عمر بمشکل پچیس برس کی تھی۔ اور یہ بھی دھیان میں رہے کہ نوجوان خلیل الرحمٰن اعظمی نے بہادر شاہ ظفر کے نقادوں کے بارے میں بے تکلف کہہ دیا ہے: ''ظفر پر جو تھوڑی بہت رائیں ہمارے پچھلے نقادوں نے دی ہیں وہ بالکل غلط نہیں لیکن نامکمل یا یک طرفہ ضرور ہیں اور وہ اس وجہ سے کہ کسی نے ظفر کے پورے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہیں کیا ہے۔''

اسی طرح حسرت موہانی کے بارے میں ان کا مضمون، جو اسی 1952 کا لکھا ہوا ہے، ہمیں چونکاتا ہی نہیں، ہمیں ایک نئے تنقیدی مزاج سے آشنا کرتا ہے:

''سنتے ہی دل میں اتر جانے والے اشعار پسندیدہ ہو سکتے ہیں لیکن ان میں کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ بڑے شاعر کا شعر ذرا مشکل سے گلے کے نیچے اترتا ہے۔ ہم اس سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ محسوس کرتے ہیں کہ یہ کوئی بڑی بات ہے۔''

مضمون کے آخر میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے:

''حسرت... صرف دوئم درجے کے شعرا کا رنگ کامیابی سے نباہ سکے ہیں... نہ تو ان کی شخصیت میں گداز ہے اور نہ ہی ذہنی تصادم و کشمکش۔ ان کے یہاں ایک

طرح کی معصومیت ملتی ہے جو دلکش ہے لیکن باعظمت نہیں''۔

میں اسی بات کو یوں کہتا کہ حسرت کے مزاج میں سادہ مزاجی اور سادہ لوحی ہے۔لیکن 1952 میں، جب حسرت کا غلغلہ چاردانگ عالم میں تھا، خلیل الرحمن اعظمی نے جو کہا وہ غیر معمولی جرأت کی بات تھی۔ یہاں یہ بات بھی خیال میں رکھیے کہ خلیل الرحمن اعظمی اس وقت ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے۔ ذرا غور کیجیے کہ کس ترقی پسند نقاد نے بہادر شاہ ظفر، یا آتش، یا حسرت موہانی کو پڑھنے اور ان پر بھرپور مضمون لکھنے کی زحمت گوارا کی؟ بجا کہ بعد میں سجاد ظہیر نے حافظ پر اور سردار جعفری نے میر اور غالب پر لکھا۔ لیکن انھوں نے اس وقت لکھا جب ترقی پسند تحریک کی شدت اور مبلغانہ جوش میں کمی آچکی تھی اور گزشتہ زمانوں کے سرمایے کے خلاف ترقی پسندوں کا تعصب بہت گھٹ گیا تھا۔ پھر یہ بھی ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی کے غیر ترقی پسند پیش رووں (یعنی میراجی، راشد، فیض، اختر الایمان، مجید امجد وغیرہ) میں شاید میراجی نے بہادر شاہ ظفر یا آتش جیسوں میں کچھ دلچسپی لی ہو تو لی ہو، لیکن ان شعرا یا ان جیسے دوسرے شعرا کا پورا کلیات پڑھنے کی زحمت کسی نے بھی گوارا نہ کی تھی۔

یہ بات درست ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی نے ابھی اپنے مکتبی استادوں کے اثر سے خود کو پوری طرح آزاد نہ کیا تھا۔ وہ شاعری کو ذاتی جذبات اور محسوسات کا اظہار سمجھنے پر مصر تھے۔ اسی لیے انھوں نے ظفر کی ان غزلوں کو بہت برا بھلا کہا ہے جو خیال بندوں کے انداز میں اور مشکل اور کڈھب زمینوں میں ہیں۔ انھوں نے ظفر کے کلام کو کئی قسموں میں تقسیم کیا اور ان کے خیال میں سب سے خراب قسم ان اشعار کی تھی جو ''ٹیڑھی ٹیڑھی'' زمینوں اور ''عجیب و غریب'' قافیوں میں کہے گئے ہیں۔ انھوں نے لکھا:

> ''نہ صرف یہ کہ یہ معمولی اور بے جان اشعار ہیں بلکہ اتنے خراب ہیں کہ آج ان اشعار پر آپ نہ صرف ہنسیں گے بلکہ ان کے پڑھنے سے جمالیاتی احساس کو اس قدر ٹھیس پہنچتی ہے کہ مذاق سلیم رکھنے والا شخص اس قسم کی شاعری سے نفرت کرنے لگتا ہے۔''

ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ درست نہیں ہے اور انگریزی ذہن کی پیدا کردہ تقلیدی ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ خلیل الرحمن اعظمی نے عام عقیدے کے برخلاف بہادر شاہ ظفر کی شاعری کو دوسروں کی جھولی میں نہیں ڈالا اور ان کی شاعری کے معتدبہ حصے کی جو توصیف کی وہ اپنے وقت سے بہت آگے کی تھی۔ اور ایک طرح دیکھیے تو خلیل الرحمن اعظمی نے ظفر کی شاعری کی تعیین قدر کے

لیے بالکل نئی راہیں پیدا کیں۔ اس بات میں (یعنی کلاسیکی شعرا کی تفہیم نو کے معاملے میں) خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے معاصرین سے قطعی ممتاز ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشا اور ناصر کاظمی جدید شعرا کے ان پیش روؤں میں سے ہیں جنھوں نے نئی شاعری کے لیے فضا تیار کی اور پھر وہ خود بھی اس منظر کا حصہ بنے جس کو انھوں نے ادب کے افق پر بے نقاب کیا تھا۔ آج وہ تینوں ہم میں نہیں ہیں اور ان کو ہمارے درمیان سے اٹھے ہوئے اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ ان کے کارنامے کی قدر و قیمت متعین کرنے کا کام شروع کیا جاسکتا ہے لیکن جو وقت گزرا ہے وہ اتنا طویل بھی نہیں کہ یہ شعرا اپنے مکمل صحیح تناظر میں نظر آنا شروع ہوجائیں۔ اس لیے میں نے یہ کہا کہ ان کے کارنامے کی قدر و قیمت متعین کرنے کا کام محض شروع ہی ہوسکتا ہے، اس کی تکمیل میں ابھی کئی سال لگیں گے۔ ہم عصروں اور ماضی قریب کے ادیبوں کا مطالعہ کرنے میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ ہمارے ذہن میں ان کی شخصیت کا پرتو ان کے کلام کے نقوش کو متاثر کردیتا ہے۔ لہٰذا ہم ان کے کلام کا مطالعہ اس تاثر کی روشنی میں کرنے لگتے ہیں جو ان کی شخصیت نے ہمارے ذہن پر چھوڑا ہے۔ بعض اوقات شخصیت کا تاثر، خود اپنے بارے میں شاعر کے فیصلے، شاعری کے بارے میں اس کے رویے، یہ چیزیں اس درجہ حاوی ہوجاتی ہیں کہ کلام کا مطالعہ مفروضات کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ مفروضات شخصیت کے حوالے سے درست، لیکن خود کلام کے حوالے سے غلط ہوسکتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ میں اصلاً اور اولاً شاعر ہوں، تنقید میرا ثانوی مشغلہ ہے۔ انھوں نے اپنے اولین مجموعۂ مضامین ''فکر و فن'' (1956) میں لکھا ہے:

> ''مضمون نگاری کو میری ادبی زندگی میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے اپنی شخصیت کے سارے عناصر کی ترتیب و تہذیب اب تک اسی نقطۂ نظر سے کی ہے کہ شعر کے پردے پر اپنی روح کو بے نقاب کرسکوں''۔

اگر ہم ان کے اس قول کو صحیح تسلیم کرلیں تو ان کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہوں گے۔ کیونکہ خلیل الرحمٰن اعظمی ان چند لوگوں میں سے تھے جن کی شاعری اور تنقید یکساں وقعت کی حامل تھی۔ یوں تو بہت سے شاعروں نے تنقید لکھی ہے اور بہت سے نقادوں نے شاعری کی ہے لیکن ایسے لوگ کم ہوئے ہیں جنھوں نے دونوں میدانوں میں یکساں یا تقریباً یکساں اہمیت کا سرمایہ چھوڑا ہو۔ ان چند لوگوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی نمایاں مقام کے مالک ہیں۔ لیکن چونکہ شاعری میں طور طریقے اور اسالیب جلد جلد بدلتے ہیں، اس لیے خلیل الرحمٰن اعظمی کی بہت سی شاعری آج پرانی

معلوم ہونے لگی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے زندہ اور نمائندہ عناصر کا مطالعہ کیا جائے تاکہ تاریخی اہمیت اور ادبی اہمیت کے عناصر الگ الگ نمایاں ہوسکیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نئی شاعری میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی تاریخی اور ادبی اہمیت برابر کا وزن رکھتی ہیں۔ تاریخی اہمیت سے انھیں ابن انشا پر تقدم بھی حاصل ہے، کیونکہ جس زمانے میں ابن انشا ابھی اپنی راہ تلاش کر رہے تھے اور نوجوانی کے سادہ جذبات کے اظہار میں گم تھے، خلیل الرحمٰن اعظمی نے ذاتی اظہار کی کئی پیچیدہ راہیں طے کرلی تھیں۔ اجتماعی اظہار سے گریز، بلکہ فرار کی کوشش میں ان شعرا کو جن لوگوں سے مدد مل سکتی تھی وہ حسرت، فراق، جگر اور یگانہ تھے۔ حسرت اور جگر کی دنیا اتنی محدود اور جگر کا اسلوب اتنا سطحی (اگرچہ مقبول) تھا کہ ان لوگوں سے کشادِ خاطر کی توقع نہ تھی۔ غزل میں سیاسی موضوعات کو برتنے کی کوشش کے باوجود حسرت کی جذباتی رسائی بہت دور تک نہ تھی۔ فراق کے یہاں رسائی کا التباس تھا اور ان کی غیر معمولی شہرت اور اثر بھی ان کے مقلد کے لیے مہمیز کا کام کر سکتے تھے۔ یگانہ کے یہاں بقول آل احمد سرور اکڑ تو تھی لیکن فرحت انگیزی نہ تھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اور ان کے ساتھیوں کو یگانہ کی طرح خم ٹھونک کر ہر کس و ناکس سے نبرد آزما ہونے کا شوق بھی نہ تھا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشا اور ناصر کاظمی نے الگ الگ اپنے طور پر میر کو منتخب کیا اور میر کے حوالے سے خود سے خود کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں فراق سے بھی اکتساب کیا۔

اس وقت ابن انشا اور ناصر کاظمی سے بحث نہیں، لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اسلوب اور فکر کی سطح پر میر سے کوئی خاص یا براہ راست فائدہ نہ حاصل کیا۔ یہ اور بات ہے کہ خود انھوں نے اپنی شاعری پر میر کے فیضان کا ذکر بہت کھل کر اور بڑے تیقن کے ساتھ کیا ہے۔ ''نیا عہد نامہ'' کے دیباچے میں جوان کی داخلی زندگی اور شاعرانہ ارتقا کی داستان ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا ہے:

> ''میر کی آواز کو اپنی آواز سمجھنا میرے لیے محض غزل گوئی یا شاعری کا راستہ نہیں تھا بلکہ یہ میری پوری زندگی کا مسئلہ تھا۔ اس آواز کا سراغ مجھے نہ ملتا تو میری روح کا غم جو اندر سے مجھے کھائے جا رہا تھا نہ جانے مجھے کن اندھی وادیوں کی طرف لے جاتا''۔

اس دیباچے میں انھوں نے میر کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ''مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے ان کو بھی اپنے زمانے میں اس نوع کی تنہائی سے واسطہ پڑا تھا''۔ ناصر کاظمی نے بھی کچھ ایسی ہی بات

کہی تھی کہ "میر کے زمانے کی رات ہمارے زمانے کی رات سے آملی ہے۔" میر سے متاثر ہونے کے بارے میں اتنے واضح بیان اور اس اثر پذیری کی اتنی واضح وجہ (یعنی دونوں کے تجربات میں بظاہر داخلی اشتراک) کے ہوتے ہوئے یہ نتیجہ فطری تھا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کو طرز میر کا شاعر سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کو طرزِ میر کا شاعر کہنا ان کی انفرادیت کے ساتھ ناانصافی اور خود میر کے ساتھ ناانصافی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری میں میر کا حصہ ہے، لیکن بہت چھوٹا سا۔ ان کی بہترین غزلوں کو کسی دوسرے شاعر کے سیاق وسباق میں رکھ کر پڑھنا مناسب نہیں۔

میر کی نمایاں ترین صفات حسب ذیل ہیں۔ ڈرامائی اور افسانوی اظہار، جنس اور عشق کے معاملات میں بے تکلفی، جسم اور روح (یا دماغ) کے معاملات پر پوری طرح دسترس، زبان کے سلسلے میں تحکمانہ اور بے پروا انانیت، رعایت لفظی سے شغف، استعارہ اور پیکر کی کثرت، معنی آفرینی اور مضمون آفرینی کا التزام، حس مزاح اور طنز یعنی Irony اور Satire کی فراوانی، کائناتی احساس جو بہ یک وقت مقامی بھی ہے اور مقام سے ماورا بھی، تصوف سے واقعی اور اصلی دلچسپی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اور ناصر کاظمی کے یہاں یہ صفات یا تو مفقود ہیں یا بہت کم ہیں۔ خود فراق صاحب کے یہاں ان میں سے اکثر کا دور دور تک پتہ نہیں، بلکہ ان میں بعض چیزیں جو خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشا اور ناصر کاظمی کی قلمرو سے باہر نہ تھیں، فراق کی رسائی ان تک بھی نہ تھی۔

پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر خلیل الرحمٰن اعظمی نے میر سے کوئی قابل ذکر براہ راست استفادہ نہیں کیا تو انھوں نے یہ کیوں کہا کہ میں نے میر کی آواز کو اپنی آواز سمجھا؟ اور خود خلیل الرحمٰن اعظمی کا اپنا رنگ کیا ہے؟

پہلے سوال کا جواب تو ان باتوں میں ہے جو میں نے کچھ دیر پہلے عرض کیں۔ پنجابیت اور اجتماعی اظہار کو مسترد کر کے اور جگر اور حسرت، یگانہ کو نامنظور کر کے (کیونکہ ان کا ذاتی اظہار یا تو رسومیاتی تھا یا مفید مطلب نہ تھا) خلیل الرحمٰن اعظمی کو ایسے نمونے کی تلاش تھی جو اس قسم کی شاعری کا جواز بن سکتا جو ان کی شخصیت میں وہ تلاطم پیدا کر رہی تھی جس کے لیے غالب نے "زلف خیال نازک و اظہار بے قرار" کا استعارہ وضع کیا ہے۔ میر نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو یہ سکھایا کہ با جماعت اظہار بیان کے بجائے یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی اپنی شاعری میں ویسا ہی نظر آئے جیسا وہ ہے۔ شاعر کو ہر راہ چلتے سے جھگڑا کرنے اور اپنی شخصیت کو منوانے کی ضرورت نہیں (جو میرزا یگانہ کا ڈھنگ تھا)۔ اسے سادہ لوح جذبات کو روایتی شیرینی اور سرمستی کے ساتھ بیان کرنا ضروری نہیں (جیسا کہ جگر صاحب کا رنگ تھا)۔ اس کو عشق اور ظاہری زندگی کی سطح پر تیرتے ہوئے خوش رنگ لیکن

ہلکے برگ و غنچہ کو چننے کی ضرورت نہیں (جیسا کہ حسرت موہانی کا انداز تھا)۔

میر نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو یہ سکھایا کہ شاعر کو تو وہ سب کچھ کہنا چاہیے جو اس کے اندر ہے۔ اسے اپنے داخلی واردات سے شرمانا نہیں چاہیے۔ تلخی ہو، غصہ ہو، مایوسی، فریب شکستگی ہو، جھنجھلاہٹ ہو، کام و دہن کی لذت ہو یا جسم کے ولولے ہوں۔ اللہ میاں سے ناچاقی ہو، اپنے آپ سے نفرت ہو، اپنے آپ سے محبت، ہو پڑوسیوں سے جنگ ہو، روح کی بلند کوشی ہو، لازوال بے پایاں وسعت جو بھی ہو، وہ سب بیان کر دینا چاہئے۔ گذری ہوئی چیزوں کو یاد کرنا اور ان کو قیمتی سمجھنا کوئی عیب نہیں۔ جو چیزیں ہاتھ نہ آسکیں ان کو ان چیزوں سے بہتر سمجھنا جو ہاتھ لگ گئیں گھاٹے کا سودا ہو لیکن نادانی نہیں۔ غمگین ہونا بھی اتنی ہی بڑی حقیقت ہے جتنی عظیم الشان حقیقت فتح کے شادیانے گانا۔ تنہائی بھی انسان کا مقدر ہے اور عیش وصال اور سماجی لین دین بھی۔ انسان کہیں بند نہیں، کہیں آزاد نہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کو شعر گوئی کے فن یا اسلوب کی تلاش نہ تھی۔ انھیں حوصلے کی تلاش تھی اور یہ حوصلہ انھیں میر نے دیا۔ بھلا سوچئے، میر کے سوا کون ایسے شعر کہہ سکتا تھا۔

جگر چاکی ناکامی دنیا ہے آخر
نہیں آئے جو میر کچھ کام ہوگا
وصل میں رنگ اڑ گیا میرا
کیا جدائی کو منھ دکھاؤں گا

خلیل الرحمٰن اعظمی پوری طرح طرز میر کے شاعر نہیں ہیں۔ لیکن بہرحال حقیقت یہ ہے کہ میر نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو ترقی پسندوں کے ہاتھ سے خرید کر آزاد کر دیا۔ پھر انھوں نے اپنی شخصیت خود دریافت کر لی۔

میں یہ نہیں کہتا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کوئی بڑے شاعر ہیں۔ یہ فیصلہ تو مستقبل کرے گا۔ ہم عصروں کے بارے میں بڑے چھوٹے کا حکم لگانا نہ ممکن ہے نہ مناسب۔ اس وقت کم سے کم یہ کہا جانا چاہئے کہ وہ اچھے اور اہم شاعر ہیں۔ انھوں نے عمر بھی بہت کم پائی۔ ان کے آخری زمانے کی نظمیں جو ''زندگی اے زندگی'' میں شامل ہیں، اظہار کی ایسی بے باکی اور تخیل اور زبان کے ایسے تلاطم خیز انتشار کی حامل ہیں کہ جان کلیئر John Claire کے زمانۂ جنون کے کلام کی یاد دلاتی ہیں۔ ممکن ہے کہ ان راہوں سے گذر کر ان کو کوئی ایسی شاہراہ مل جاتی جو ارض ابد کو جاتی ہے۔ ممکن ہے ''تانڈو ناچ''، جیسی نظم لکھتے وقت انھیں خیال رہا ہو کہ اب انھیں بہت دن نہیں جینا ہے اور اس وقت انھیں وہ سب کر گذرنا چاہئے جو ایک عمر کی کلاسیکی تربیت اور شخصیت کے حزم واحتیاط اور اپنی

شہرت اور حیثیت اور مرتبے کے لحاظ کے باعث وہ اب تک نہ کر سکے تھے۔ ایسی نظم جس میں الفاظ کا سیلاب بامعنی اور بے معنی کی حدود توڑتا ہوا نکل جاتا ہے، جس میں Surrealism کی خودکار تحریر سے لے کر جرمن موسیقار واگنر Wagner کی تمنا، کہ لفظ کو موسیقی بنا دیا جائے، اور آرتھر سائمز (Arthur Symons) کے اس خیال کا شائبہ موجود ہو کہ علامت نگار شاعر دراصل مرئی موسیقی (Visible Music) خلق کرتا ہے، اس خلیل الرحمٰن اعظمی کے لیے شاید ممکن نہ تھی جو علی گڑھ کی ''متین اور سنجیدہ'' روایت کا پاسدار تھا۔ جو رشید احمد صدیقی کا شاگرد تھا اور جس نے اپنی حسِ طنز و مزاح کے اظہار کیلیے ہجویں تو لکھیں، لیکن جس نے غزل کو ایک فنِ لطیف و شریف کی طرح برتا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے میر کی طرح شاہانہ لفنگے پن سے نہیں، بلکہ میر اثر اور میر حسن کی طرح روک روک کر اور سوچ سوچ کر بات کی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل کی بنیادی صفت ایک آہستہ رو خودکلامی ہے۔ ایسی خودکلامی جس میں حیات، کائنات اور ذات میں واقع ہوتی واردات پر رائے زنی ہے۔ جانب داری، شکایت یا خودترحمی نہیں۔ اسے خودکلامی سے زیادہ مراقبے میں گذرنے والی واردات سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کو جو نام چاہیں دیں، لیکن شخصیت کے اظہار کا یہ طرز خلیل الرحمٰن اعظمی کے سوا کسی کو نصیب نہ ہوا۔

اپنے آپ سے بات کرنا تو جدید غزل کے لیے عام شیوہ ہے۔ اس لیے آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اس میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی تخصیص کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عام خودکلامی میں ذات پر گذرنے والی واردات یا ذات کے سوالات اور جوابات ہوتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس کو حیات، کائنات اور ذات تینوں کے اظہار اور تینوں پر رائے زنی کے لیے استعمال کیا۔ عام خودکلامی میں رائے زنی اسی حد تک ہوتی ہے جس حد تک شاعر اسے خود کو قائم کرنے یعنی Establish کرنے کے لیے ضروری سمجھے۔ خودکلامی کبھی کبھی صلاح مشورے اور طنز و تعریف کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔ لیکن دھیمی آواز میں یعنی کسی ظاہری احتجاج کسی سنائی دینے والی Stridence اور کسی بے محابا تنقید کے بغیر تمام پیچیدگیوں پر رائے زنی کرنے کا فن خلیل الرحمٰن اعظمی کا اپنا فن تھا۔ ان کی غزل ہم سے بات کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یا یہ محسوس ہوتا ہے کہ جو باتیں وہ اپنے سے کرتے رہے ہیں وہ ہمارے لیے بھی معنی خیز ہیں اور ہم نے کہیں سے ان کو سن لیا ہے۔ ان کا آخری مجموعہ ''زندگی اے زندگی'' جو ابھی شائع ہوا ہے۔ اسی کا زیادہ تر حصہ ان کی چھوٹی سی زندگی کے بحرانی اور تغیر پذیر دور کی یادگار ہے۔ اس سے کوئی ایسا نتیجہ نکالنا جو ان کے پورے کلام

پر منطبق ہو سکے، شاید بہت صحیح نہ ہو۔ لیکن خود کلامی اور دھیمے لہجے میں رائے زنی کی یہ صفت اس کلام میں بھی پوری طرح جلوہ گر ہے۔

دنیا داری تو کیا آئی دامن سینا سیکھ لیا
مرنے کے تھے لاکھ بہانے پھر بھی جینا سیکھ لیا

گھر میں بیٹھے سوچا کرتے ہم سے بڑھ کر کون دکھی ہے
اک دن گھر کی چھت پہ چڑھے تو دیکھا گھر گھر آگ لگی ہے

کس راستے پہ جاؤں چلوں کس کے ہم رکاب
جمتے نہیں ہیں پاؤں کہ لغزش بہت ہے یاں

گھر کی ویرانی یہ کہتی ہے کہیں اور چلوں
میں کہاں جاؤں کہاں کے لیے بستر باندھوں

سگ دیوانہ سے بدتر یہ سگ دنیا ہے
ورنہ سوچا تھا کہ دونوں کو برابر باندھوں

پھر مری راہ میں کھڑی ہوگی
وہی اک شے جو اجنبی ہوگی

نہ دیکھا چشم تر نے کوئی موسم
وہی بس ایک ساون کا مہینہ

مرے وجود کی سب کو خبر اسی سے ملی
جو غرق خوں ہے اسی تیغ آبدار میں ہوں

ہمیں تو راس نہ آئی کسی کی محفل بھی
کوئی خدا تو کوئی ہمسایۂ خدا نکلا

اس آخری شعر پر میر کا طنطنہ یاد آتا ہے۔ میر کے شعر کے بغیر خلیل الرحمن اعظمی کا شعر ممکن نہ تھا۔

لیکن یہ بھی دیکھئے کہ میر اور خلیل الرحمٰن اعظمی دونوں کے یہاں وہ بے مزہ اور شے لطیف سے عاری ڈینگ نہیں جسے بعض لوگ ''شاعرانہ طنطنہ'' سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے شعر میں میر جیسی تہ داری نہیں ہے، لیکن مزاج اسی طرح کا ہے۔ میر کا شعر سنئے ؎

الٰہی کیسے ہوتے ہیں جنھیں ہے بندگی خواہش
ہمیں تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

خلیل الرحمٰن اعظمی کی دوسری صفت، جس میں کوئی ان کا ہمسر نہیں، ان کی تفتیش ذات ہے۔ اظہار ذات کی ایک شکل تو یہ ہے کہ شاعر اپنے اوپر گذرنے والے تجربات کو بیان کرے اور اس کے ذریعہ، یا براہ راست، اپنی شخصیت کے اچھے برے گوشوں کو بے نقاب کرے۔ دوسری اور زیادہ پیچیدہ شکل یہ ہے کہ شاعر اپنے تجربات اور شخصیت کے گوشوں، مزاج کی افتاد، عمل اور رد عمل کے طریقوں کے بارے میں سوال پوچھے۔ ایسا کیوں ہے؟ میں ایسا کیوں ہوں؟ مجھ کو یہ بات ایسی کیوں لگی؟ یہ محض تجسس نہیں بلکہ ایک بیدار، بے چین، باضمیر اور مفکر ذہن کا تفاعل ہے ۔

میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خود نما ہوں میں

کوئی تو بات ہوگی جو کرنے پڑے ہمیں
اپنے ہی خواب اپنے ہی قدموں سے پائمال

ہیں تو سوال اب بھی ایسے جن کا کوئی جواب نہیں
پوچھنے والا پوچھ کے ان کو اپنا دل بہلاتا ہے

زیب دیتے نہیں یہ طرہ و دستار مجھے
میری شوریدہ سری سنگ ملامت مانگے

قرض سب باقی پڑا ہے لمحۂ موجود کا
کیوں سراپا انتظار لمحہ آئندہ ہوں

خوش آگیا ہے مجھے کیوں خرابۂ ہستی
خیال مرگ بتا تو ہی کس دیار میں ہوں

ان اشعار کا تفکر رسمی تفکر نہیں بلکہ ذہن اور ضمیر کے مسائل سے الجھا ہوا ہے۔ ان میں وہ حزن آلود اضطراب ہے جس کی حدیں علم و یقین، عقیدہ اور توہم، سب کچھ ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل نے آہستہ آہستہ ترقی کی، لیکن اس کا ہر قدم مستحکم اور ہر سفر نتیجہ خیز تھا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نادرروزگار شخص تھے۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے خراج تحسین وصول کیا، معاصروں کو بغاوت اور انحراف کی راہیں دکھائیں، اور اپنے بعد والوں کے لیے ہمت افزائی کے سرچشمے اور نمونے کا کام کیا۔ اس سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کی خلاقانہ قوتیں، ان کا علم، اور سب سے بڑھ کر ادب سے ان کی غیر مشروط وابستگی، یہ سب ادبی دنیا میں اظہر من الشمس تھا۔ لہٰذا جب انھوں نے دین بزرگاں کو ناپسند کرنے یا بعض کھوئے ہوؤں کی جستجو، یا کچھ نئی دنیائیں آباد کرنے کی مہمیں سر کرنا شروع کیں تو کسی کو یہ مجال گفتار نہ تھی کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کسی مصلحت، کسی ذاتی منفعت، یا کسی تنگ نظر ردعمل سے مجبور ہو کر یہ کام کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اگر چہ وہ یونیورسٹی کے ماحول میں تھے جہاں پھونک پھونک کر نقش پائے رفتگاں پر قدم رکھنے کو عقل مندی کی معراج سمجھا جاتا ہے، لیکن خود ان کا جذبۂ بینی و حق گوئی کا اس قدر قوی تھا کہ انھوں نے اپنے ادبی سروکاروں اور ترجیحات میں انھیں چیزوں کو رکھا جنھیں وہ صحیح سمجھتے تھے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ جیتے جی انھیں یونیورسٹی سے وہ کچھ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔

بہت سے لوگ اچھے شاعر اور نقاد ہوتے ہیں، لیکن تعلیم و تدریس ان کے بس کی نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ اچھے استاد ہوتے ہیں لیکن تحریر و تصنیف کا روگ نہیں پالتے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بہت کم عمری میں ادب کی دنیا میں نام پیدا کر لیا تھا۔ عنفوان شباب میں جب وہ یونیورسٹی میں استاد مقرر ہوئے تو معلوم ہوا کہ وہ جتنا اچھا لکھتے ہیں، اتنا ہی اچھا پڑھاتے بھی ہیں۔ بے مثال حافظہ، غیر معمولی طور پر وسیع علم، اور کئی علوم پر پھیلے ہوئے طالب علموں اور نو آمدہ فن کاروں کی ہمت افزائی، ان صفات نے انھیں مقبول خلائق بنا دیا تھا۔ تحریر کے میدان میں تنقید اور شاعری دونوں پر انھیں اس قدر تسلط تھا کہ یہ فیصلہ اکثر مشکل ہو جاتا کہ ان کی اصل، داخلی شخصیت میں شاعر مقدم ہے کہ نقاد۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا، وہ خود کو اصلاً شاعر قرار دیتے تھے۔ لیکن ان کی تنقیدی کتابیں، مثلاً ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک'' اور مضامین مثلاً ''مقدمۂ کلام آتش'' اور ''نوائے ظفر'' آج بھی معنی خیز ہیں۔ ان کے کئی شعر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ضرب المثل ہو گئے اور آج وہ جدید شاعری کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

ایسی راتیں بھی ہم پہ گذری ہیں
تیرے پہلو میں تیری یاد آئی

کہیں زخم بھر نہ جائے کہیں تو نہ بھول جائے
یہی سوچ کر فسردہ ہیں ترے جگر فگاراں

نشۂ مے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں
کچھ بہانے مرے جینے کے لیے اور بھی ہیں

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

بار ہستی تو اٹھا نہ اٹھا دست سوال
مرتے مرتے نہ کبھی کوئی دعا ہم سے ہوئی

دل پہ اک بوجھ سا رکھا ہے کسی طور ہٹے
ورق سادہ میسر ہو تو ہم بھی لکھیں

اور یہ شعر، جوان کی ایک بہت پرانی نظم ''آپ بیتی'' کا ہے، لیکن غزل کے شعر کی طرح مشہور ہوا۔

یوں تو مرنے کے لیے سبھی زہر پیتے ہیں
زندگی تیرے لیے زہر پیا ہے میں نے

مندرجہ بالا اشعار ثبوت ہیں اس بات کا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے غزل کو ان ''روایتی'' روایات سے آزاد کرایا جو حالی اور آزاد کے زیر اثر، یا ان کے ردعمل کے طور پر ہمارے یہاں قائم ہو گئی تھیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل میں خود کلامی، خلاقانہ فکر، کائنات کی وسعت، بے معنویت، لیکن اس میں گہری تنظیم کا احساس، یہ سب اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ وہ غزل جوان کے پہلے سادہ بیانی کی ماری ہوئی تھی، دور دور تک سرایت کرتی ہوئی ایک نئی پیچیدگی سے ہم کنار نظر

آنے لگی۔ خلیل الرحمن اعظمی نے اپنی نظم کو بھی بہت حد تک براہ راست بیان اور سطح کے ابال سے محفوظ رکھا۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی خود کلامی درون بینی میں بدلتی گئی اور اس صفت نے ان کی نظم کو اظہار ذات کا سچا نمونہ بنا دیا۔

خلیل الرحمن اعظمی کے بارے میں دو باتیں ملحوظ رکھنے کی ہیں۔ اول تو یہ کہ انھیں شاعر کے مرتبے کا احساس تھا۔ انھیں معلوم تھا کہ یہ مرتبہ آخر میں خاموشی کی طرف لے جاتا ہے۔ سبک ہندی کے شعرا، خاص کر بیدل اور غالب کی طرح انھیں بھی احساس تھا کہ شاعری کی بلند ترین منزل پر شاعر ختم ہو جاتا ہے، صرف خاموشی رہ جاتی ہے۔ بیدل ؎

اگر معنی خامشی گل کند
لب غنچہ تعلیم بلبل کند

سخن اگر ہمہ معنیست نیست بے کم وبیشے
عبارتیست خموشی کہ انتخاب نہ دارد

بیدل کی طرح غالب نے اس مضمون کو اکثر باندھا ہے ؎

سخن ما زلطافت نہ پذیرد تحریر
نہ شود گرد نمایاں ز رم توسن ما

طول سفر شوق چہ پرسی کہ دریں راہ
چوں گرد فرو ریخت صدا از جرس ما

اسی طرح کا ایک شعر خلیل صاحب کے یہاں بھی ہے، لیکن ذرا بدلے ہوئے لہجے میں ؎

یہ تمنا نہیں اب داد ہنر دے کوئی
مجھ کو آ کر مرے ہونے کی خبر دے کوئی

اس شعر نے مجھے مدتوں پریشان رکھا کہ خلیل الرحمن اعظمی کے کلام میں انفعالیت یا خود پر افسوس کرنے کے انداز تو کہیں نہیں ملتے، پھر اس شعر کا کیا مطلب ہے؟ جب مزید غور کیا اور اپنی شاعری کی روایت کے پس منظر میں اس شعر کو دیکھا تو سمجھ میں آیا کہ یہاں خاموشی کا مضمون ہے، شاعری کی بلندیاں طے ہو چکیں، اب سکوت کا سلسلہ ہے۔ جدید شاعری میں ایسا شعر کم نظر آتا ہے۔

ورڈزورتھ (William Wordsworth) نے ملٹن (John Milton) کو مخاطب کرتے ہوئے ایک سانیٹ میں لکھا تھا کہ ملٹن، تجھے اس گھڑی زندہ اور ہمارے درمیان موجود ہونا چاہیے تھا۔ انگلستان کو تیری ضرورت ہے:

Milton! thou should'st be living at this hour:
England hath need of thee: she is a fen
Of stagnant waters:

ورڈزورتھ نے اپنے زمانے کے انگلستان کو "ٹھہرے اور سڑتے ہوئے پانی کا جوہڑ" کہا تھا۔ اسی سانیٹ میں آگے وہ کہتا ہے:

We are selfish men;
Oh! raise us up, retum to us again;
And give us manners, virtue, freedom, power.

ورڈزورتھ اپنے درد کے درماں کے لیے ملٹن کو پکارتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم لوگ "خود غرض" لوگ ہیں۔ اے ملٹن، تو "دوبارہ ہم میں آ جا۔ ہماری سطح کو بلند کر دے اور ہمیں خوش خلقی، نیک خصلتی، آزادی، اور قوت عطا کر۔" معلوم نہیں ورڈزورتھ آج ہم لوگوں کو کیا کہتا، کہ آج تو ہمارا حال قابل بیان بھی نہیں رہا۔ ہمارے زمانے کے ادب میں جس قسم کی دوڑ بھاگ، ذاتی مفاد اور چند لمحوں کی کامیابی کے لیے جوڑ توڑ، نااہلی کی ہمت افزائی، اور اہلیت کی کم ارزی کا جو طوفان برپا ہے، اس میں ٹھہراؤ اور ہمارے مزاجوں میں اعتدال لانے کے لیے ملٹن نہ سہی، لیکن خلیل الرحمن اعظمی کا ادب، ان کی زندگی، اور خود ان کی شخصیت ہمارے لیے مشعل راہ کا کام کر سکتے ہیں۔ ایمرجنسی کے زمانے میں خلیل الرحمن اعظمی نے ایک شعر کہا تھا۔

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بے دماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

خلیل صاحب، آپ کو آج زندہ اور ہمارے درمیان موجود ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں آپ جیسے بے دماغوں کی اشد ضرورت ہے۔

شمس الرحمن فاروقی

کاغذی پیرہن

ابتدائیہ

خلیل الرحمٰن اعظمی نام کا ایک شاعر اپنے نغمات کا پہلا مجموعہ شائع کر رہا ہے۔ وہ نئی نسل کا ایک بے پروا اور لا اُبالی سا نوجوان ہے لیکن اس کی یہ بے پروائی اور لاابالی پن دراصل اپنے اُن زخموں کو چھپانے کی ایک ناکام سی کوشش ہے جو اس کے سینے میں جلتے رہتے ہیں۔ اس کی عمر یہی چھبیس ستائیس سال ہوگی مگر کوئی اس سے پوچھتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا کروگے پوچھ کر؟ میرے ہر ہر سال میں کئی کئی عمریں چھپی ہوئی ہیں۔ میں اب تک اپنی زندگی میں کئی بار مر چکا ہوں۔ نوجوان ورتھر کی طرح میں نے بھی خودکشی کی ہے۔ رام چندر کی طرح بن باس لیا ہے اور میرے اجودھیا کی ہوائیں مجھ سے لپٹ لپٹ کر روئی ہیں۔ یوسف کی طرح زنداں میں ڈال دیا گیا ہوں اور میرے گھر کی دیواریں میری راہ تکتے تکتے اندھی ہوگئی ہیں۔ میرا دامن بارہا چاک ہو چکا ہے۔ مسیح کی طرح مجھے بھی صلیب پر لٹکایا گیا ہے اور دیوداس کی طرح ناکامی کے زہر کا پیالہ پینا پڑا ہے۔

وہ کہتا ہے صرف ایک بات ہے جس نے مجھے شاعر بنا دیا ہے۔ میں نے یہ زہر امرت کی طرح پیا ہے اور شیو جی کی طرح اسے اس طرح متھ ڈالا ہے کہ اس سے تخلیق کے سوتے پھوٹ پڑے ہیں۔ میں مر کر ہمیشہ کے لیے نہیں مرتا موت کی کوکھ سے پھر جنم لیتا ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں جب اس دنیا سے چلا جاتا ہوں تو میری نظمیں میرا نام لے لے کر پکارتی ہیں۔ پتے پتے، بوٹے بوٹے سے میرا حال پوچھتی ہیں۔ گلی گلی کے چراغوں سے کہتی ہیں تم نے اس راہ سے اس کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے؟ دریاؤں اور سمندروں میں جال ڈالتی ہیں کہ میں ان میں تو نہیں ڈوب گیا ہوں جل پریوں کے دیس میں جا کر ڈھونڈتی ہیں کہ میں ادھر تو نہیں آنکلا ہوں اور راستے

کے دیوتاؤں نے مجھے پتھر کا بنا کر کسی جگہ پر نصب تو نہیں کر دیا ہے۔ میری نظمیں اس پتھر پر پانی چھڑکتی ہیں اور میں پھر جی اٹھتا ہوں۔ وہ مجھے دوبارہ اپنے دیس میں لے آتی ہیں۔

یہ شاعر ایک عجیب و غریب انسان ہے۔ کہتا ہے کہ اس کے سینے کے اندر اسی دھرتی کے برابر ایک اور دھرتی ہے۔ وہاں اس کا ایک خوبصورت سا گاؤں ہے۔ لہلہاتے ہوئے کھیت ہیں۔ سوندھی سوندھی مٹی کا بنا ہوا ایک صاف ستھرا گھر ہے۔ اس کی چھت پر روز چاندنی اترتی ہے اور اپنے پیروں میں گھنگرو باندھ کر ناچتی ہے۔ وہ اپنے بیوی بچوں کو لے کر چاندنی کے ساتھ کھیل رچاتا ہے اور سب مل کر ایک ایسا گیت گاتے ہیں جس سے پھولوں کی بارش ہوتی ہے اور خوشبو سے بسی ہوئی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔

وہ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ کوئی اس سے پوچھتا ہے تم ایسی نظمیں کیوں لکھتے ہو تو مسکراتا رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے ذرا فلاں طرز کی نظم لکھ کر دو تو لکھ دیتا ہے لیکن پھر کہتا ہے کہ یہ نظم میری نہیں ہے۔ میری نظمیں اور میرے اشعار وہ ہیں جو میں نے راتوں کی تنہائی میں اپنے آنسوؤں سے لکھے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

5۔ حالی روڈ، علی گڑھ
مئی 1955

کوک کروں تو جگ ہنسے اور چپکے لاگے گھاؤ
ایسی کٹھن سنیہہ کا کس بِدھ کروں اُپاؤ
(کبیر)

نقشِ اوّل

(1947 تا 1952)

میرا گھر، میرا ویرانہ

دیدنی ہے یہ مرا گھر، مرا ویرانہ بھی
اس گزرگاہ پہ کچھ دیر ٹھہر جا سیاح

مجھ کو معلوم ہے تو سارا جہاں دیکھ چکا
ہاں اُفق تا بہ اُفق ساری زمیں دیکھی ہے
تو نے ایوان بھی دیکھے ہیں، کھنڈر بھی دیکھے
وادیاں دیکھیں، پہاڑوں کی جبیں دیکھی ہے

میری دنیا بھی ذرا دیکھ کہ اس دُنیا کو
دیکھنے والوں نے اب تک کبھی دیکھا ہی نہیں
میں فسانہ ہوں، کوئی چاہے تو مجھ کو لکھ لے
پر مرا حال کسی نے کبھی پوچھا ہی نہیں

تجھ کو اے دوست! دکھاؤں کہ کہاں رہتا ہوں
یہ وہ گھر ہے کہ جو شاید کبھی ہو سکتا تھا گھر
تجھ کو شاید نہ نظر آئے مگر یہ سچ ہے
اس کے سینے میں ہیں پوشیدہ مرے لعل و گہر
یہ زمیں اُجڑی ہوئی، ٹوٹی ہوئی ہے دیوار
پر اسی کوکھ میں دھرتی کی ہے سرمایہ مرا
میں جو اس وقت نظر آتا ہوں یہ میں نہیں ہوں
میری تصویر ہے، دھندلا سا ہے یہ سایہ مرا

میری تصویر کی آنکھوں میں بسا ہے اک شہر
اس میں ہیں اونچے محل جو میں بنا سکتا تھا
اس میں ہیں میری وہ خوشیاں کہ جو مل سکتی تھیں
اس میں ہے میری وہ منزل جو میں پا سکتا تھا

اس میں ہیں میری محبت کے وہ سارے ارماں
جن سے محروم رہا میرا یہ بیدار شباب
یادِ محبوب میں ۔ گائے ہوئے گیت اس میں
اس میں ہیں میرے وہ اشعار نہیں جن کا جواب

ہاں یہیں دفن ہیں وہ ساری کتابیں جن کو
زندگی دیتی جو فرصت تو میں لکھ سکتا تھا
اسی مٹی میں ہیں وہ نظمیں، وہ غزلیں میری
جن کو کہنے کوئی دیتا تو میں کہہ سکتا تھا

میرے سیّاح ! بہت تو نے مقابر دیکھے
سچ کہا صدیوں میں اک تاج محل بنتا ہے
ہاں مگر میری طرح روز ہی کوئی انساں
زندہ رہنے کے لیے دہر میں مرجاتا ہے

یاد

اب بھی دروازہ روز کھلتا ہے
راستہ میرا تک رہا ہے کوئی
میرے گھر کے اُداس منظر پر
کوئی شے اب بھی مسکراتی ہے
میری ماں کے سفید آنچل کی
ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں روتی ہیں
فاصلہ اور کتنی تنہائی
آج کٹتی نہیں ہیں یہ راتیں
آسماں مجھ پہ طنز کرتا ہے
چاند تاروں میں ہوتی ہیں باتیں

اے وطن تیرے مرغزاروں میں
میرے بچپن کے خواب رقصاں ہیں
مجھ سے چھٹ کر بھی وادیاں تیری
کیا اُسی طرح سے غزل خواں ہیں

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا...

سیاہ زنجیر سے الجھنے کا کس کو یارا ہے اے رفیقو!
قدم قدم پر ہماری رہ میں ہزار فتنے گڑے ہوئے ہیں
جہاں کبھی لحظۂ تبسم پہ کتنی کلیاں مہک اٹھی تھیں
اسی چمن کی روش روش پر یہ سرد لاشے پڑے ہوئے ہیں

نہیں ہے صیاد سے شکایت کہ آشیاں اپنا لُٹ گیا ہے
خود اپنے ہاتھوں سے ہم صفیروں نے تنکے تنکے کو پھونک ڈالا
سنا ہے پہلے فلک نے لوٹا تھا میری دلّی کے میکدوں کو
پر اب کے ساقی کی ایک سازش سے جل گئے خود ہی جام و مینا

کہاں پہ اب میرا کارواں ہے، کہاں پہ یہ شام ہوگئی ہے
سیاہیاں کون لے کے آیا کہ صبح بدنام ہوگئی ہے
ہر ایک دل میں نئی بغاوت، ہر اک کرن آج آتشیں ہے
مرے لہو میں ہی آج ڈوبی، مرے وطن کی یہ سرزمیں ہے
(1947)

شامِ اودھ

میں سوچتا ہوں خلاؤں میں کیسے رنگ بھروں
نہ وہ اُفق ہے، نہ وہ آسماں کی پہنائی
شفق کے پھول یہاں جیسے کچھ اُداس سے ہیں
ہوا میں اُڑتے تو ہیں اب بھی ریشمی آنچل
مگر یہ حسن کے جلوے بھی بدحواس سے ہیں

وہ سائے ڈھلنے لگے اور میرے کانوں میں
کہیں سے گونج اٹھا پھر وہی ادھورا گیت
پرانی یادوں کی موہوم سی کسک لے کر
نئی بہار، نئی صبح کے تصور میں
سنہری کرنوں نے چھیڑی ہے اک مدھر سنگیت

مگر نہ جانے مرے ساز کی اسی دُھن پر
کہاں سے آکے اک افسردگی سی منڈلائی
وہ سائے ہٹنے لگے اور پھر ابھرنے لگی
نظر کے سامنے صدیوں کی کوئی پرچھائیں
سیاہ زخموں سے ٹپکیں لہو کی کچھ بوندیں
کسی خیال سے سہمی ہوئی ہیں زنجیریں
حیات آج پھر اک بار جیسے شرمائی

ہیں زہر خند لبوں پر لیے، یہ دیواریں
انھیں کی اوٹ میں شاید وہ اپنی دنیا ہے
جہاں اک اور افق ہے اک آسماں ہے اور
جہاں فضا میں تبسم ہے مہ جبینوں کا

جہاں ہے پیار مرے دیس کی زمینوں کا
جہاں ہوا میں وہ ملبوس سرسراتے ہیں
کہ جن کے لمس سے کلیوں میں جان آجائے
جہاں ستاروں کی ٹھنڈک میں چاند سوتا ہے
جہاں کہ ساز پہ شبنم کے رقص ہوتا ہے
انھیں فصیلوں کے پیچھے تو اب بھی راتوں کو
انھیں دھندلکوں میں، ان گومتی کی موجوں میں
نہ جانے کتنے ہی نغمے جوان ہوتے ہیں

وہ پھیلتی چلی جاتی ہے جیسے تاریکی
وہ ڈوبتا چلا جاتا ہے کائنات کا دل
وہ ایک ہاتھ بڑھا جیسے چھیننا چاہے
کوئی اُڑان مرے عشق کے تخیل کی
یہاں تو شام اودھ بھی اسیر ہے جیسے

نہ جانے کیا ہے کہ بے کیف سی فضاؤں میں
ترا خیال بھی اب رنگ بھر نہیں سکتا
مری نگاہ میں ہیں اب بھی وہ ترے گیسو
مگر ابھی تو یہ منظر سنور نہیں سکتا
(ڈسٹرکٹ جیل، لکھنؤ 1949)

لہو کی تحریر

(جواں سال شاعر اشعر ملیح آبادی کی موت پر)

آج پھر ایک حسین قوس قزح ٹوٹ گئی
کتنے رنگین دھندلکوں نے سنوارا تھا اُسے
چھپ کے دیکھا تھا اسے شام کی تنہائی نے

مرمریں خواب کی لہروں نے پکارا تھا اسے
اسے چاہا تھا شب ماہ کی رعنائی نے

آج ر ڈوب گیا میرا وہ زرّیں مہتاب
اپنے سینے میں جسے میں نے چھپا رکھا تھا
آج پھر ٹوٹ گئے کتنے نئی صبح کے خواب
رات کے پچھلے پہر میں نے جنھیں دیکھا تھا

آج خاموش ہے وہ قصۂ آدم کہ جسے
سن کے بیدار ہوا تھا یہ مرا عزمِ جواں
آج پھر دھندلے سے ہیں آئینے مستقبل کے
نکہت و نور ہیں پھر آج لہو میں غلطاں
آج پھر ایک حسیں قوس قزح ٹوٹ گئی
(جنوری 1950)

شامِ وداع

اپنے ہاتھوں سے جلایا تھا جسے تم نے کبھی
اپنے ہاتھوں سے بجھا دو وہ محبت کا چراغ

پھول کھلتے تھے نگاہوں میں سمائی تھی بہار
تم نے آکر کسی محمل سے پکارا بھی تو تھا
تم نے بھیجا تھا کبھی مجھ کو وفا کا پیغام
ایک نادیدہ تبسم کا چھلکتا ہوا جام
جس نے اک دن مری دنیا کو سنوارا بھی تو تھا
اک رفاقت کے تصور کا سہارا لے کر
میں نے تعمیر کیا تھا وہ خیالوں کا جہاں

جس میں دم توڑتے دیکھا تھا خزاں کو میں نے
رقص کرتی ہوئی آئی تھی جہاں صبح بہار
جس نے اک بار گرادی تھی یہ اونچی دیوار
جس میں اک بار تو ٹوٹے تھے یہ اوہام کے جال
ہم نے اک بار یہاں دی تھی اندھیرے کو شکست
ماہتابوں سے سجائی تھی جنوں کی محفل

بڑھ کے پھر روک دی یہ وقت کی کس نے رفتار
ناشنیدہ تھا ابھی نغمۂ شب تاب مرا
پہلی ہی نیند کے جھونکے میں جگایا کس نے
کس نے پھر چھین لیا آ کے حسیں خواب مرا
پھر وہی آہنی دیوار ہے تاریکی ہے
آج پھر شام کے سینے سے دھواں اٹھتا ہے

سر کو ٹکرا کے یہ کہتا ہوں کہ اب کیا ہوگا
میں تو مجرم بھی ہوں جرأت رندانہ کروں
تم یہ کہتی ہو کہ اغیار میں چرچا ہوگا
پاس ناموس وفا جب نہ رہا تم کو ہی
کون پھر آج بھری بزم میں رسوا ہوگا

میں تمنا کے کھلونوں سے بہت کھیل چکا
اس محبت میں بھی اب جی نہیں لگتا میرا
مشورہ ہے مری وحشت کا کہیں بھاگ چلو
چل کے اس شہر سے، اس گھر سے کہیں دور بسو
الوداع اے مرے خوابوں کی حسیں شہزادی
یوں سمجھنا یونہی جھوٹا سا کوئی قصہ تھا
ایک یونہی سی پری تھی، کوئی شہزادہ تھا

جا کے انجان سے اک دیس میں وہ کھویا گیا
اب نہ ایوان زمستاں کی طرف آئے گا

اب بھلادو مرے ماضی کے وہ عہد و پیاں
دفتر غم سے مٹا دو وہ مرا نام و نشاں
اب نہ دیکھو کبھی بھولے سے بھی میری تصویر
درد دل اس سے تو کچھ اور بھی بڑھتا ہوگا
اب بجھادو یہ سسکتے ہوئے یادوں کے چراغ
ان سے کب ہجر کی راتوں میں اُجالا ہوگا

برہ کی ریکھا

جانے کب پورا ہو پیاری تجھ سے ملنے کا ارمان
آج بہت ہی ڈر لگتا ہے اپنی اس تنہائی سے
شام کے ان ڈھلتے سایوں سے، غم کی اس پہنائی سے
سرد ہواؤں کی آہٹ سے درد کی اس شہنائی سے
تو جو نہ ہوگی تو آئیں گے کتنے انجانے مہمان
تیری یادوں سے اس گھر کو یوں تو سجا کے رکھوں گا
تیرے خیالوں کی خوشبو سے دل کو بسا کے رکھوں گا
تیرے پیار کو سارے جگ سے یوں تو بچا کے رکھوں گا
پھر بھی کانپ اٹھتا ہوں پیاری جیسے آئے گا طوفان
ڈر ہے کہیں وہ رات نہ آئے جب پاگل ہو جاؤں میں
تجھ کو ڈھونڈنے نکلوں لیکن اور کہیں کھو جاؤں میں
تھک کر اور کسی آنچل کے سائے میں سو جاؤں میں
اپنے پیار کا ہوگا پیاری اس میں بہت اپمان

جن راتوں میں نیند نہ آئے

جن راتوں میں نیند نہ آئے
تیرا جاگنے والا آخر
کن باتوں سے جی بہلائے

کتنے اچھے لوگ تھے وہ بھی
ایسی جدائی کی گھڑیوں میں
تارے گنتے رہتے تھے
جو اک جھوٹے وعدے پر بھی
جانے کیسے کھُلا رکھتے تھے
اپنے گھر کا ہر دروازہ
صبح تلک آنے والے کی
راہیں دیکھا کرتے تھے
اپنے دل کی تنہائی کو
چند ادھورے سپنوں سے ہی
وہ آباد کیے رکھتے تھے
ان کے برہا کے گیتوں میں
جھلمل آنسو کے پردے میں
میٹھے پانی کا چشمہ بھی
دھیرے دھیرے بہتا تھا

تیرے اک جانے پر لیکن
میرا یہ کیا حال ہوا ہے؟
اپنے آپ سے میں روٹھا ہوں
میرا دل خود مجھ سے خفا ہے

میرے کان بھی میری باتیں
مجھ سے آج نہیں سنتے ہیں
گھر میں اتنی تاریکی ہے
آنکھیں ساتھ نہیں دیتی ہیں
سارے روزن، سارے دریچے
سب دروازے بند پڑے ہیں

جاگتے سائے

کوئی کہانی سناؤ کہ آج دل بہلے
کسی طرح تو گزر جائے یہ پہاڑ سی رات
مریضِ غم کی طرح چیختے ہیں یہ لمحات

یہ آج کیسی فضا ہے یہ کیسا موسم ہے؟
ہوا اُداس ہے، پھولوں کی آنکھ پُرنم ہے
لہو اترتا ہے کیوں آج چشم ساقی میں
پسینے آئے ہیں آبِ حیات کے دل کو
کہاں سے لاؤں اُس اجڑی ہوئی سی محفل کو

سہاگ لٹ سا گیا سوگوار شمعوں کا
صبا کی گود میں سوتی ہے خاکِ پروانہ
مجھے نہ چھیڑو کہ اس یاد کے اندھیرے میں
سسک رہا ہے مری زندگی کا افسانہ

مری وفا کا کوئی گیت آج مت گاؤ
وہ آرہا ہے کوئی سانپ پھن اٹھائے ہوئے

وہ اپنے دوش پہ ماضی کی لاش کو لے کر
مری ہی سمت چلا مشعلیں جلائے ہوئے
خدا کے واسطے دروازہ آج بند کرو
پھر اک بار یہ آفت کہیں نہ آجائے
شگاف بنتی چلی جارہی ہیں دیواریں
یہ کون جانے مرے گھر کا آج کیا ہوگا

وہ دیکھو کوئی دریچوں کو کھٹکھٹاتا ہے
وہ کوئی شے ہے جو اک بار چھن سے ٹوٹی ہے
میں دیکھتا ہوں مگر کچھ نظر نہیں آتا
کہاں گئی مرے اللہ میری بینائی
کھلی ہے آنکھ مگر کوئی شقف و بام نہیں
ارے یہ کون سا عالم ہے، کیسی دنیا ہے
میں کھوگیا ہوں کہاں آج ہے خودی میری
حکایتِ رخ و کاکل کے ناز بردارو
مجھے بھلا دو کہ اب میرا کوئی نام نہیں

مرا خود اپنی کہانی میں جی نہیں لگتا
مجھی سے خود مرے گیتوں کا ذکر مت چھیڑو
مرے ادھورے فسانوں کو آج مت دہراؤ
میں چاہتا ہوں کہ یہ خواب اجڑ بھی جائے کہیں
مری وفا کے نشانات سارے مٹ جائیں
وہ سارے لمحے کہ تصویر کھینچ کر جن کی
کبھی سجائے تھے میں نے بھی اپنے کاشانے
وہ لمحے آج فضا میں کہیں بکھر جائیں
میں ڈھونڈنا بھی جو چاہوں تو ان کو پا نہ سکوں

جو چھیڑنا ہے تو کچھ ایسے گیت اب چھیڑو
کبھی جو سازِ محبت پہ گائے جا نہ سکے
جو دیکھنے ہیں تو اب ایسے خواب دیکھوں گا
جنھیں چرا نہ سکے جن کو کوئی پا نہ سکے
دیارِ حسن سلامت مگر مرے ہمدم!
میں اپنے جلتے ہوئے زخم اب کہاں لے جاؤں
کہانی ایسی سناؤ کہ نیند آجائے
کہانی ایسی سناؤ کہ آنکھ کھل جائے

لمحۂ جاوداں

آنے والے کی راہ تک تک کر
سو گئے زندگی کے ویرانے

ذوقِ عرفاں، نہ کوئی جذبِ دروں
فکرِ درماں نہ کوئی سوزِ مآل
اک گھنے بوجھ کے تلے دب کر
اب سسکتی ہے آرزوئے وصال
رات کے سرد سرد ہونٹوں سے
میرے ماضی کے سارے افسانے
آج بن کر لہو ٹپکتے ہیں
رہ گیا ڈوب کر دھندلکے میں

مسکراتا ہوا وہ چاند کا کھیت
پھر کوئی خامشی سے گھبرا کر
چھیڑنے جارہا ہے غم کا ساز
اور میرا خمارِ نیم شبی

میری آوارگی کے یہ نغمے
موت کی سمت بڑھتے جاتے ہیں

شعلۂ عشق آج زخمی ہے
سرد ہیں آسماں کے انگارے
رکتی جاتی ہیں دھڑکنیں دل کی
تھمتی جاتی ہے آج بادِ شمال
ختم ہوتی ہیں اب جنوں کی حدیں
آج اس رہگذر پہ آ پہنچا
جس جگہ آکے دل رباؤں کی
یاد بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے

تھام لے آج اے شعورِ حیات
لڑکھڑاتے ہوئے سے قدموں کو
میرے سینے میں چیختی ہے ابھی
ایک موہوم جستجو میری
میرے ارماں کدے میں رہ رہ کر
جیسے اک لمحہ گنگناتا ہے
ایک لمحہ مری محبت کا
جب کہ تزئینِ زندگی کے لیے
میں نے اک اجنبی کو چاہا تھا
آج جی چاہتا ہے میں بڑھ کر
اس لمحے کو جاوداں کردوں

آخری رات

مت بُجھا دل ناداں
سوگوار شمعوں کو
اب بھی غم کے ماروں کی
آدھی رات باقی ہے

خواب کی تہوں میں اب
چھپ گئے ہیں جا جا کر
زندگی کے سوداگر
ہے جہانِ بے پایاں
اک قریۂ ویراں
اور میری یہ دھرتی
کروٹیں بدلتی ہے
جیسے درد کے مارے
کوئی کچھ نہ کہہ پائے
چونک چونک اُٹھتی ہے
راستے کی خاموشی
موت جیسے کرتی ہو
زندگی سے سرگوشی
میں نے اشک بوئے تھے
جن فسردہ آنکھوں میں
اُن سے خون رِستا ہے
اُن سے آگ بہتی ہے

میرے سامنے آ کر
ناچ ناچ اٹھتی ہیں
میری اپنی تصویریں
کتنی بار جب میں نے
زندگی لٹائی ہے
اور کسی کی چاہت میں
زلزلے سے آئے ہیں
آسمان ٹوٹا ہے
جان پر بن آئی ہے
شل ہوئے ہیں یہ شانے
تھک گئی ہیں آشائیں

لیکن آج بھی ہمدم!
یہ اُداس دروازے
شاہراہ کی جانب
جیسے تکتے رہتے ہیں
دیکھ ان دریچوں پر
کوئی بوند پھر ٹپکی
نیند کے درختوں کو
کوئی پھر ہلاتا ہے
اور جیسے رہ رہ کر
میرے کان بجتے ہیں
موت کے قدم کی چاپ
آکے لوٹ جاتی ہے
میری ناتمام الفت
آسرا دلاتی ہے

آج جاگ کر کاٹو
ساعتِ فسردہ کو
آج کوئی آئے گا
آج کوئی آئے گا

آپ بیتی

یوں تو مرنے کے لیے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لیے زہر پیا ہے میں نے

شمع جلتی ہے پر اک رات میں جل جاتی ہے
یاں تو اک عمر اسی طرح سے جلتے گزری
کون سی خاک ہے یہ جانے کہاں کا ہے خمیر
اک نئے سانچے میں ہر روز ہی ڈھلتے گزری

کس طرح میں نے گزاری ہیں یہ غم کی گھڑیاں
کاش میں ایسی کہانی کو سنا بھی سکتا
طعنہ زن ہیں جو مرے حال پہ اربابِ نشاط
ان کو اک بار میں اے کاش رُلا بھی سکتا

میں کہ شاعر ہوں، میں پیغامبرِ فطرت ہوں
میری تخئیل میں ہے ایک جہان بیدار
دسترس میں مری نظارۂ گلہائے چمن
میرے ادراک میں ہیں کن فیکون کے اسرار
میرے اشعار میں ہے قلبِ حزیں کی دھڑکن
میری نظموں میں مری روح کی دلدوز پکار

پھر بھی رہ رہ کے کھٹکتی ہے مرے دل میں یہ بات
کہ مرے پاس تو الفاظ کا اک پردہ ہے
صرف الفاظ سے تصویر نہیں بن سکتی
صرف احساس میں حالات کی تفسیر کہاں
صرف فریاد میں زخموں کی وہ زنجیر کہاں
ایسی زنجیر کہ ایک ایک کڑی ہیں جس کی
کتنی کھوئی ہوئی خوشیوں کے مناظر پنہاں
کتنی بھولی ہوئی یادوں کے پُراسرار کھنڈر
کتنے اجڑے ہوئے، لوٹے ہوئے سنسان نگر
کتنے آتے ہوئے جاتے ہوئے چہروں کے نقوش
کتنے بنتے ہوئے مٹتے ہوئے لمحات کا راز
کتنی الجھی ہوئی راہوں کے نشیب اور فراز

(2)

کیا کہوں مجھ کو کہاں لائی مری عمرِ رواں
آنکھ کھولی تو ہر اک سمت اندھیرے کا سماں
رینگتی اونگھتی مغموم سی اک راہ گزر
گردِ آلام میں کھویا ہوا منزل کا نشاں
گیسوئے شام سے لپٹی ہوئی غم کی زنجیر
سینۂ شب سے نکلتی ہوئی فریاد و فغاں
ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہواؤں میں وہ غربت کی تھکن
در و دیوار پہ تاریک سے سائے لرزاں

کتنی کھوئی ہوئی بیمار و فسردہ آنکھیں
ٹمٹماتے سے دیے چار طرف نوحہ کناں
مضمحل چہرے مصائب کی گراں باری سے
دلِ مجروح سے اٹھتا ہوا غمناک دھواں

یہی تاریکیٔ غم تو مرا گہوارہ ہے
میں اسی کوکھ میں تھا نور سحر کے مانند
ہر طرف سوگ میں ڈوبا ہوا میرا ماحول
میرا اجڑا ہوا گھر میرؔ کے گھر کے مانند

اک طرف عظمتِ اسلاف کا ماتھے پہ غرور
اور اک سمت وہ افلاس کے پھیلے ہوئے جال
ناتواں باپ مرا جرمِ ضعیفی کا شکار
ماں کی آنکھوں سے ٹپکتا ہوا اندوہ و ملال
بھوک کی آگ میں جھلسے ہوئے سارے ارماں
قرض کے بوجھ سے جینے کی امنگیں پامال

وقت کی دھند میں لپٹے ہوئے کچھ پیار کے گیت
مہر و اخلاص زمانے کی جفاؤں سے نڈھال
بھائی بھائی کی محبت میں نرالے سے شکوک
نگہ غیر میں جس طرح انوکھے سے سوال
''ایک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق''
مفلسی ساتھ لیے آئی تھی اک جنگ و جدال
فاقہ مستی میں بکھرتے ہوئے سارے رشتے
تنگدستی کے سبب ساری فضائیں بے حال

اک جہنم کی طرح تھا یہ مرا گہوارہ
اس جہنم میں مرے باپ نے دم توڑ دیا
ٹوٹ کر رہ گئے بچپن کے سہانے سپنے
مجھ سے منہ پھیر لیا جیسے مری شوخی نے
میرے ہنستے ہوئے چہرے پہ اداسی چھائی
جیسے اک رات بھیانک مرے سر پر آئی

راہیں دشوار مگر راہ نما کوئی نہ تھا
سامنے وسعتِ افلاک خدا کوئی نہ تھا

میرے اجداد کی میراث یہ ویران سا گھر
جس کو گھیرے ہوئے ہر سمت تباہی کے بھنور
جس کی چھت گرتی ہوئی ٹوٹا ہوا دروازہ
ہر طرف جیسے بکھرتا ہوا اک شیرازہ
نہ کہیں اطلس و کمخواب، نہ دیبا و حریر
ہر طرف منہ کو بسورے ہوئے جیسے تقدیر
مجھ کو اس گھر سے محبت تو بھلا کیا ہوتی
ہاں اگر دل میں نہ جینے کی تمنا ہوتی
یہ سمجھ کر کہ یہی ہے مری قسمت کا لکھا
اس کی دیوار کے سائے سے میں لپٹا رہتا
باندھ لیتا یونہی افلاس سے اپنا دامن
راس آجاتی مجھے زیست کے ماتھے کی شکن

لیکن اس دل کی خلش نے مجھے بیدار کیا
مجھ کو تقدیر سے آمادۂ پیکار کیا
بے کسی رختِ سفر بن کے مرے ساتھ چلی
یاد آئی تھی مجھے گاؤں کی ایک ایک گلی
لہلہاتی ہوئی فصلیں، وہ مرے آم کے باغ
وہ مکانوں میں لرزتے ہوئے دھندلے سے چراغ
دور تک پانی میں پھیلے ہوئے وہ دھان کے کھیت
اور تالاب کنارے وہ چمکتی ہوئی ریت
میرے ہم عمر، وہ ساتھی، وہ مرے ہمجولی
میرے اسکول کے وہ دوست، مری وہ ٹولی
ایک بار ان کی نگاہوں نے مجھے دیکھا تھا

جیسے اک بار مرے دل نے بھی کچھ سوچا تھا
''میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو''
(نا تمام)

کہانیاں

میں جن کو آگہی کی گود میں سلا کے آیا تھا
مرے خدا وہی کہانیاں کہاں سے جاگ اٹھیں
وہی ہے سیلِ رنگ و بو
وہی چراغِ شام کی حسین مسکراہٹیں
قدم قدم پہ سانولی سی رات کا فسوں لیے
کوئی پھر آج گیا
کوئی پھر آج آ کے میرے ذہن و دل پہ چھا گیا
پکارتی ہیں آج مجھ کو پھر جنوں کی وسعتیں
کوئی بلا رہا ہے مجھ کو آنچلوں کی چھاؤں میں
وہ خواب ہائے دلنشیں
میں جن کو دفن کر چکا تھا کب کا ٹھنڈی ریت میں
غبار بن کے اڑ رہے ہیں آج پھر فضاؤں میں

اسی غبار کے تلے مرا وہ گاؤں ہے چھپا
جہاں پہ میں نے پہلی بار آسماں کو دیکھا تھا
یہیں پہ ایک ماہ وش کے چاہنے کی آرزو
مرے لیے حیاتِ نو کا جام لے کے آئی تھی
کسی کی دلنواز مسکراہٹوں کے سائے میں
مری نگاہ کو ملا وہ ذوقِ جستجو جسے
جہاں کی بے پناہ وسعتیں بھی راس آئی تھیں
شفق کے رنگ میں نہا کے میرا چاند آیا تھا

فضا میں بس گئی تھیں جیسے سنبلوں کی نرمیاں
ہوا کے دوش پر رواں تھا نکہتوں کا کارواں
نکھر گئی تھی یہ زمیں، سنور گیا تھا آسماں
مرے وطن کی بنسری میں جتنے گیت تھے چھپے
نکل کے میرے ہونٹ سے فضا میں ناچنے لگے
مگر مری وہ بنسری، مری نوائے آتشیں
ہزاروں آفتاب و ماہتاب جس سے جل اٹھے
مرے جنوں کے زمزمے
کہ جن سے کتنے واعظانِ پاک تھرتھرا اٹھے
بس ایک لمحہ بھر میں جیسے سرد ہو کے رہ گئے
مری رفیق، مری روح، میری ماہ وش کہیں
جہاں کی آندھی وادیوں میں جیسے جا کے کھو گئی
مرا ادھورا شاہکار جیسے کوئی چھین لے
لہو کی موج بڑھ کے میرے آسماں پہ چھا گئی
مری وہ جنتِ خیال تیرگی میں ڈوب کر
فنا کے گھاٹ اتر گئی
میں جیسے تلملا اٹھا
قسم یہ کھائی اب نہ پھر کسی سے دل لگاؤں گا
میں اس جہاں کو چھوڑ دوں گا سب سے روٹھ جاؤں گا
یہ سوچ کر میں ظلمتوں کے ساتھ ساتھ چل پڑا
یہ جی میں آئی آج ہی میں زہر کھا کے سو رہوں

مگر یہ زندگی مجھے
اُڑا کے اپنے بازوؤں پر لائی ایک شہر میں
منارے نور کے مری نظر کو خیرہ کر گئے
ہر ایک سمت تیز روشنی کی جگمگاہٹیں
مجھے پتہ چلا کہ جیسے میری آنکھ کھل گئی

کسی نے آ کے یہ کہا
تم آج تک پڑے ہوئے تھے ایک گہری نیند میں
تمھارا گاؤں اور عشق صرف ایک خواب تھا
یہ سنتے ہی میں جاگ اٹھا
یہ سوچنے لگا کہ مجھ کو موت کی ہوس ہے کیوں
ابھی نہ جانے کتنی اور منزلیں ہیں سامنے
ابھی حیات کے نہ جانے کتنے اور روپ ہیں
مرے لیے نہ جانے کب سے منتظر ہیں بام و در
یہ کھوئی کھوئی راہیں تک رہی ہیں مجھ کو دیر سے
وہ کشتیاں بندھی ہوئی ہیں ٹونس کے کنارے پر
یہ سوچتی ہیں جانے کب وہ آنے والے آئیں گے
ندی کے پار جائیں گے
جہاں یہ چاندنی کے سائے مل کے سبزہ زار سے
مدھر سا گیت گاتے ہیں
یہ گیت مجھ کو اپنی سمت جیسے کھینچنے لگے
میں رک کے سوچنے لگا
یہاں میں ایک اجنبی ہوں، اک غریب شہر ہوں
یہاں وہ کون ہے جو میرے دل کے داغ دیکھے گا
یہاں وہ کون ہے جو جانے آنسوؤں کی آگ کو
مری زبان کون سمجھے اس دیارِ غیر میں
مگر دیارِ غیر میں اک اور اجنبی ملا
پہاڑ پور کی طرف سے اک ستارہ آ گیا
اندھیری رات آنکھ مل کے مجھ کو دیکھنے لگی
ہزار شمعیں جیسے میرے دل میں جھلملا اٹھیں
اک اور آسماں سے ٹوٹ کر بکھر چکا تھا یہ
اس اجنبی کا دل بھی زخم سے لہولہان تھا
مگر مرے ان آنسوؤں کی آب و تاب دیکھ کر

وہ زخم گنگنا اٹھے
ہم ایک ساتھ چل پڑے
ندی کے پار سبزہ زار میں بہار آگئی
کنارِ آب نو سبر کا چاند مسکرا اٹھا
یہ آرزو ہوئی کہ اب زمین و آسماں کا رنگ
ابد تلک یہی رہے

مگر مری حیات کا یہ خواب بھی بکھر گیا
اُس اجنبی نے کیا کیا
میں کیوں نہ اس کے ساتھ رہ سکا
مرا دیار، میرا شہر جو مجھے عزیز تھا
جہاں گلی، گلی کو میری چاہ تھی، مجھی سے پیار تھا
جہاں کے راستوں پہ میرے پاؤں کے نشان تھے
میں کیوں وہاں سے بھاگ کر چلا گیا
میں کیسے اپنے دوستوں کو، ساتھیوں کو بھول کر
وطن سے دور آ بسا
اور اس کے بعد شہر شہر کیوں میں گھومنے لگا
میں کیوں ترس کے رہ گیا کسی خوشی کے واسطے
یہ کس نے آ کے تلخیٔ جہاں کا زہر دے دیا
مرے تمام جسم کو جلا کے کس نے رکھ دیا
اسی میں خیر ہے نہ چھیڑ میرے اس فسانے کو
مری کہانیوں نے مجھ کو سانپ بن کے ڈس لیا
مری وفا نے آج مجھ کو بے زبان کر دیا
مری کہانیوں کا غم مرے سکوں کو چھین کر
زمین و آسماں کے بیچ چھوڑ کر چلا گیا

(1952)

نئی فصل
(1955)

کاغذی پیرہن

کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے موسم بدل رہا ہے
اٹھوں اور اب اٹھ کے کیوں نہ اس گھر کے سارے دروازے کھول ہی دوں
میرے دریچوں پہ جانے کب سے دبیز پردے لٹک رہے ہیں
میں کیوں نہ ان کو الگ ہی کر دوں
مرا یہ تاریک و سرد کمرہ
بہت دنوں سے سنہری دھوپ اور نئی ہوا کو ترس رہا ہے
جگہ جگہ جیسے اس کی دیوار کی سپیدی اکھڑ گئی ہے
ہر ایک کونے میں کتنے جالے لگے ہوئے ہیں
مرے عزیزوں، مرے رفیقوں کی یادگاریں
یہ ساری تصویریں جیسے دھندلی سی پڑ گئی ہیں
یہ شیلف، جس میں مری کتابیں ہیں
میز، جس پر مرے سبھی کاغذات بکھرے ہوئے پڑے ہیں
یہ سب کے سب گرد سے اٹے ہیں
مری کتابیں
میں کیا بتاؤں کہ کس قدر ہیں عزیز مجھ کو
بہت سی ایسی ہیں جو مرے دوستوں نے تحفے میں مجھ کو دی ہیں
وہ دوست جو جاں نثار تھے میرے، کس قدر چاہتے تھے مجھ کو
میں ان کے ہاتھوں کی پیاری تحریر ان کتابوں پہ دیکھتا ہوں
کچھ ایسے الفاظ، ایسے فقرے
جو ان کے ہاتھوں نے صرف میرے لئے لکھے ہیں
یہ میرے غمخوار، میرے دکھ درد کے امین ہیں
انھیں کتابوں میں بعض ایسی بھی ہیں کہ جن کو
نہ جانے کس طرح فاقہ مستی کے حال میں روپے بچا کر

خریدلیتا تھا تاکہ میں علم وفن کی یہ تشنگی بجھاؤں
مرے یہ سب کاغذات جو منتشر پڑے ہیں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے میں ان سے بیزار ہو چلا ہوں
اگر چہ یہ جانتا ہوں ان کے سوا ہے کیا کائنات میری
مری تصانیف، میرے مضمون، میری نظموں کی ساری پونجی
وہ شے کہ جس کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ جو میرے کام آئی
مری کتابیں، مری بیاضیں، مسودے میری فکروفن کے
نہ جانے کتنے ہی ناشروں کے حسین فائل میں کچھ دنوں رہ کے
پھر دوبارہ اس اجڑے کمرے میں آکے آباد ہو گئے ہیں

میں جس زمانے میں ان کتابوں کو لکھ رہا تھا
عجب جنوں تھا
عجیب طوفان میرے دل میں امنڈ رہا تھا
نہ نیند آتی تھی رات کو اور نہ دن کو دم بھر سکون ملتا
کہ جیسے خود زندگی نے ہاتھوں کو میرے لوح وقلم دیا ہو
انھیں کتابوں میں
میرے دل کی تمام دھڑکن
مری تمنا
مرے ارادوں کی ساری گرمی
مری محبت کے سارے نشتر چھپے ہوئے ہیں
میں آج ان کاغذات کو الٹ کر جو دیکھتا ہوں
تو اپنے ہی دل سے پوچھتا ہوں
یہ میری لکھی ہوئی کتابیں ہیں؟
ایسے اشعار؟
ایسی نظمیں؟
کہ جن پہ خود مجھ کو رشک آئے

یہ سب مرے ذہن کا کرشمہ ہیں؟ (ہائے کیا ہیں!)
میں ان کو پہچانتا نہیں ہوں
یہ ساری تصویریں میری ایسی ہیں آج جو مجھ سے مختلف ہیں

بن لکھی کہانی

وہی مٹی کا پیارا گھر
نگاہوں میں ابھی تک پھر رہا ہے
وہی سوندھی سی خوشبو اب بھی میرے پیرہن میں ہے
میرے پیارے وطن، اے میرے پیارے گاؤں میں تجھ کو نہیں بھولا
مرے وہ دن جو تیرے ساتھ گزرے ہیں
میں ان کی ایک اک تصویر سینے سے لگائے ہوں
یہ تصویریں چھپا کر میں نے اپنے دل میں رکھی ہیں
یہ وہ البم ہے جس کو سب کی نظروں سے بچا کر
میں کبھی تنہا الٹ لیتا ہوں
اور اپنا وہ چہرہ دیکھ لیتا ہوں
کنول کے پھول کے مانند جو اک روز تازہ تھا
جسے اب کوئی میرا ہم وطن دیکھے
تو کہہ دے یہ تو کوئی اور ہے
اس شخص کا اُس کھیت اور باغوں کی بستی سے ہے کیا رشتہ
یہ البم اس لیے بھی میں چھپا کر سب سے رکھتا ہوں
کہ یہ تو شہر ہے یاں ہر طرح کے لوگ بستے ہیں
مری معصوم تصویریں نمائش گاہ کی زینت نہ بن جائیں
کوئی ان کی مدد سے ایک افسانہ نہ لکھ ڈالے

وہ جاڑوں کی سہانی راتیں اب تک یاد آتی ہیں

مری ماں اک کہانی مجھ سے کہتی تھی
کوئی شہزادہ تھا جو اک پری کا ذکر سن کر گھر سے نکلا تھا
مگر جب چلتے چلتے وہ پری کے دیس میں پہنچا
تو اس پر ایسے دیووں کا پڑا سایہ
جنھوں نے اس کو پتھر کا بنا ڈالا
مجھے جب یہ کہانی یاد آتی ہے
مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ میں بھی شاہزادہ تھا
یہاں سے دور میری راجدھانی تھی
جہاں کی لہلہاتی کھیتیوں پر میری اک دن حکمرانی تھی
مگر جب علم وفن کی اک پری کا تذکرہ سن کر
یہاں آیا تو شہرِ علم وفن کے دیوتاؤں نے
غمِ دوراں سے سازش کر کے مجھ کا کچھ بنا ڈالا
میں اپنے گھر کو اب کیا منہ دکھاؤں گا—؟

میرے اُداس دل نہ رو

میرے اُداس دل نہ رو
رونے سے تجھ کو کیا ملا
بجھتی کہاں ہے غم کی آگ
اشکوں کے ساز پر ہی چھیڑ
آج کوئی خوشی کا راگ
وقت سے پہلے روح میں کوئی بھی زہر مت سمو
میرے اُداس دل نہ رو
رونے سے اور بھی بھرم
کھلتا ہے مجھ غریب کا

خود میں برا کہاں ہوا؟
گر ہوں برا نصیب کا
اب بھی جو مجھ میں رہ گئی وہ مری آبرو نہ کھو
میرے اُداس دل نہ رو
سچ ہے کہ مجھ میں کیا رہا
ڈھیر ہوں جیسے خاک کا
پھر بھی کرید کر تو دیکھ
اس میں ہے کچھ چھپا ہوا
جو مرے ساتھ کھو گیا یہ وہی آدمی نہ ہو

نیا جنم

ابھی اک سال گزرا ہے، یہی موسم، یہی دن تھے
مگر میں اپنے کمرے میں بہت افسردہ بیٹھا تھا
نہ کوئی سانولے محبوب کی یادوں کا افسانہ
نہ ایوانِ زمستاں کی طرف جانے کی کچھ خواہش
کسی نے حال پوچھا تو بہت ہی بے نیازی سے
کہا جی ہاں خدا کا شکر ہے، میں خیریت سے ہوں
کوئی یہ پوچھتا کیوں آج کل کوئی غزل لکھی؟
نہ جانے بات کیا ہے ان دنوں کچھ ایسا لگتا ہے
تمھاری ہر غزل میں میؔر کا انداز ملتا ہے
ہر اک مصرعے سے جیسے دھیمی دھیمی آنچ اٹھتی ہے
تمھارے شعر پڑھ کر جانے کیوں محسوس ہوتا ہے
کہ کوئی ساز پر مدھم سروں میں گنگناتا ہے
مگر اک بات پوچھوں تم خفا تو ہو نہ جاؤ گے؟
یہ آخر کیا سبب ہے آج کل نظمیں نہیں لکھتے

تمھاری آپ بیتی بھی ابھی تک نامکمل ہے
اسے تو ناقدانِ فن نے سنتے ہی سراہا ہے
میں سب سنتا تھا لیکن دل ہی دل میں سوچتا رہتا
مرے احباب کیا جانیں کہ مجھ پر کیا گزرتی ہے
مرے افکار پر یہ کیسی ویرانی سی چھائی ہے
بہت کچھ سوچتا ہوں پھر بھی کچھ سوچا نہیں جاتا
بہت کچھ چاہتا ہوں پھر بھی کوئی بس نہیں چلتا
مگر اس بے بسی میں بھی مرے دل کی یہ حالت تھی
کبھی جب کوئی اچھی چیز پڑھنے کے لیے ملتی
تو پہروں روح پر اک وجد کی سی کیفیت ہوتی
رگوں میں میری جیسے خوں کی گردش تیز ہو جاتی
لہو کا ایک ایک قطرہ یہ کہتا میں تو زندہ ہوں
مری پامالیوں میں پل رہی ہے اک توانائی
یہی عالم رہا تو جانے پھر کس روز اٹھ بیٹھوں

بسنت آیا تو یوں آیا کہ میں بھی جیسے اٹھ بیٹھا
سویرا ہوتے ہی ہر سمت سے جھونکے ہواؤں کے
نئی خوشبو لیے مجھ کو جگانے کے لیے آئے
جدھر بھی آنکھ اٹھاتا ہوں شفق کی مسکراہٹ ہے
وہی سورج ہے لیکن اور ہی کچھ جگمگاہٹ ہے
نہ جانے کیسے کیسے پھول اب مجھ کو بلاتے ہیں
نہ جانے کتنے کتنے رنگ سے دل کو لبھاتے ہیں
فضا میں دور تک پھیلے ہوئے وہ کھیت سرسوں کے
یہ کہتے ہیں کہ اب ارماں نکالو اپنے برسوں کے
تمھارے سامنے پھیلا ہوا میدان سارا ہے
تمھارے چاہنے والوں نے پھر تم کو پکارا ہے
کہ [illegible] آواز دیتا ہے کہ آؤ تم ہمارے ہو

مری دھرتی کے بیٹے، میری دنیا کے دُلارے ہو
تمھاری آنکھ میں جو خواب سوئے ہیں وہ میرے ہیں
تمھارے اشک نے جو بیج بوئے ہیں وہ میرے ہیں
اسی وادی میں پھر سے لوٹ کر اب تم کو آنا ہے
تمھاری ہی یہ بستی ہے، تمھیں کو پھر بسانا ہے
اب اس بستی میں رکھتے ہی قدم کچھ ایسا لگتا ہے
کہ اس کا ذرّہ ذرّہ، پتّہ پتّہ کچھ نیا سا ہے
ہر اک رستے پہ جیسے کچھ نئے چہرے سے ملتے ہیں
یہی جی چاہتا ہے جو ملے اب اس سے یہ پوچھیں
تمھارا نام کیا ہے؟ تم کہاں کے رہنے والے ہو
کچھ ایسا جان پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے ہیں ہم
رہے ہیں ساتھ یا اک دوسرے کو جانتے ہیں ہم
اگر تم ساتھ تھے میرے تو شاید دوست تھے میرے
مجھے یاد آیا دونوں ساتھ ہی کالج میں پڑھتے تھے
وہ سارے دوستوں کا جمع ہونا میرے کمرے میں
وہ گپ شپ، قہقہے، وہ اپنے اپنے عشق کے قصے
وہ میرس روڈ کی باتیں، وہ چرچے خوبروؤں کے
کبھی آوارہ گردی اپنی ان ویران سڑکوں کی
کبھی باتوں میں راتیں کاٹنا سنسان جاڑوں کی
کبھی وہ چاندنی میں اپنا یونہی گھومتے رہنا
کبھی وہ چائے کی میزوں پہ گھنٹوں بیٹھنا سب کا
وہ باتیں علم و حکمت کی، کبھی شکوہ شکایت کی
تمھیں تو یاد ہوگا ان میں ہی اک دوست شاعر تھا
ذرا دیکھو تو مجھ کو غور سے شاید وہ میں ہی تھا
بہت دن میں ملے ہیں ہم تو آؤ آج جی بھر کر
ہنسیں بولیں، کہیں آوارہ گردی کے لیے نکلیں

چلیں اور چل کے سارے دوستوں کو پھر بلا لائیں
سجائیں آج پھر محفل کہیں پینے پلانے کی
میں تم کو آج اپنی کچھ نئی باتیں بتاؤں گا
میں تم کو آج اپنی کچھ نئی نظمیں سناؤں گا

بہ ہنگامِ وصل

آج پھر کیٹس کی اک حسین نظم کی دھن میں مجھ کو بھی اک گیت گانا پڑا
لو کہ ہنگامِ وصل آج آ ہی گیا، اپنا گھر آج مجھ کو بسانا پڑا
یہ اُداسی، یہ افسردگی، یہ تھکن، تھے خزاں کے کئی اور بھی مرحلے
سوچتا ہوں کہ ان سب کو رخصت کروں، آ رہے ہیں بہاروں کے اب قافلے
اے مری زندگی کے جواں ولولو! آؤ اب مجھ سے کچھ عہد و پیماں کرو
اب بھی جو وادیاں ہیں مری منتظر، ان میں چلنے کا بھی کوئی ساماں کرو
یہ تو سچ ہے کہ چلتے ہوئے راہ میں، کوئی چشمہ، کوئی کنج، سایہ کوئی
اپنی جانب بلاتا ہے رہگیر کو، چھیڑتا ہے کوئی نیند کی راگنی
کچھ سکوں، کچھ نشہ پا کے انسان سے چھوٹ جاتا ہے یہ وقت کا سلسلہ
موت رہتی ہے اس وقت کی منتظر، ہے فنا کا اسی سمت سے راستہ
لیکن ایسے بھی ہوتے ہیں کچھ راہرو، ساتھ جن کے ہو کوئی متاعِ گراں
ایک نوخیز و نو رستہ جنسِ ہنر، یا ادھورا سا اک خوابِ عشقِ بتاں
ایسی چنگاریاں جو تہ خاک بھی گرم رکھتی ہیں ہر نبضِ احساس کو
یہ بھری نیند سونے نہ دیں گی کبھی جیسے کھٹکا لگا کوئی رہزن کا ہو
میں بھی کچھ دیر سویا تو پھر کیا ہوا، ایسا لگتا ہے کہ کچھ تازہ دم ہو گیا
گردِ سب راستے کی جو تھی ڈھل گئی، سر پہ اک بوجھ سا تھا جو ہلکا ہوا
اب نئے موڑ پر آ کے ذہنِ رسا کہہ رہا ہے کہ چلنا ہے جس دیس کو
آ گئی ہیں اسی دیس کی اب حدیں، اب اسی آستانے پہ سجدہ کرو
اس زمیں کے لیے ہے یہ جنسِ گراں، یہ متاعِ ہنر اور یہ طبعِ رواں
میرے پیارے یہی ہے تمہارا نگر پا سکو گے یہیں لمحۂ جاوداں

دوری

تم بھی اب نہ مٹا پاؤ گے
شاید میری تنہائی کو

میرے لہو کی ساری بوندیں
برہ کی آگ میں جلتی ہیں
میرے آنسو کے سب چشمے
میری آنکھوں کے سب موتی
زہر کے اک گہرے ساگر میں
جاجا کر کھو جاتے ہیں

کتنی راحت پہنچاتی ہے
سانس تمھاری قربت کی
اور تمھارے پہلو میں
کتنی نشے سے بوجھل نیندیں
لوری مجھ کو سناتی ہیں
ہائے وہ راتیں، ہائے وہ لمحے
ہائے وہ ان کی شیرینی
تم سے مل کر، تم سے لپٹ کر
لگ کے تمھارے سینے سے جب
تھوڑی دیر کو سوجاتا ہوں
تم کو پاکر کھو جاتا ہوں

ایسی گہری نیندیں پھر بھی
جانے ایسا کیوں لگتا ہے

میرے من کے اندر جیسے
کوئی اب بھی جاگ رہا ہے
کوئی اب بھی تم سے جدا ہے
کوئی اب بھی مشعل لے کر
راہ تمھاری دیکھ رہا ہے

گیتانجلی

جب بھی گیت سنتا ہوں
شام کی ہواؤں کے
کتنے پیارے لگتے ہیں
یہ درخت، یہ پودے
جیسے میری گردن میں
ڈال کر کوئی بانہیں
میرے دل کی سب باتیں
مجھ سے پوچھنا چاہے
تم کو کون سا غم ہے؟
کیوں اداس رہتے ہو؟
تم پہ جو گزرتی ہے
کہہ سکو تو کہہ ڈالو
مجھ سے چاہتے ہیں کچھ
یہ ہرے ہرے پتے
یہ رفیقِ تنہائی
یہ چمن کے گل بوٹے

کاش کوئی دن آئے
اپنے بھائیوں کو میں
اپنے دوستوں کو میں
اپنے سارے پھولوں کو
اپنی بے زبانی کا
راز داں بنا ڈالوں
وہ کہانیاں جن سے
رات رات بھر میں نے
اپنا جی جلایا ہے
اپنی نیند اڑائی ہے
ان کو بھی سنا ڈالوں
ایسے گیت جو میری
نوجوان راتوں نے
میرے دل کی دھڑکن کے
ساز پر سنائے ہیں
ان کو بھی سکھا ڈالوں
اور سارے گیتوں میں
میرا درد بھر جائے
اور سارے پتوں پر
میرا عکس اُتر آئے

نذرانے

اور تو کیا اب تم کو بھیجوں اپنی چاہت کے نذرانے
الجھے الجھے سے ہیں یہی بس میرے دکھ کے تانے بانے
میں نے اپنی ساری پونجی، اپنی جیون بھر کی کمائی
اپنے کچھ سپنوں کی خاطر نگر نگر میں جا کے لٹائی

کیسے کیسے چہرے دیکھے، کیسے کیسے بھید ٹٹولے
کس کس در پہ صدا لگائی، کتنے ہی دروازے کھولے
سیدھا سادا بھولا بھالا بن کر کتنے دھوکے کھائے
کتنے دھبّے بدنامی کے میں نے اس ماتھے پہ لگائے
کتنی جھوٹی باتیں کی ہیں، اپنے نفس کو بہکایا ہے
اپنی ہر ہر ناکامی پر اپنے آپ کو سمجھایا ہے
کتنی خوشی محسوس ہوئی ہے اپنا غصہ پی لینے پر
پھر بھی کتنی لعنت بھیجی باتیں سہہ کر جی لینے پر
مجبوری میں پڑ کے کیا ہے سجدہ کتنے شیطانوں کو
دل پر پتھر رکھ کے کہا ہے عاقل کتنے نادانوں کو
میرا پھول سا کومل چہرہ جب بھی کبھی کمھلایا ہے
آئینے کو جھوٹا کہہ کر اپنے من کو بہلایا ہے
کتنے کچوکے کھا کھا کر بھی چپ رہنے کی عادت ڈالی
ہنستے ہنستے پی ڈالی ہے غم کے زہر کی ہر ہر پیالی
بہہ نہ سکے جو آنسو میرے ان کو بچا کر رکھا ہے
یہ ہے ایک خزانہ میرا جس کو چھپا کر رکھا ہے
اپنا کوئی مل جائے تو اس کے سامنے کھولوں گا
اس سے لپٹ کر اک دن میں بھی اب جی بھر کر رولوں گا

کنج محبت

یہ سنسان راتیں، یہ ٹھنڈی ہوائیں، یہ پھیلی ہوئی تیری یادوں کی خوشبو
یہ چپ چاپ سے پیڑ، یہ غم کے سائے، یہ دل کی کسک، یہ محبت کا جادو

یہ سب جاگتے ہیں، یہ سب سوچتے ہیں، یہ سب کروٹیں لے کے ہیں آہ بھرتے
نئی منزلوں سے، نئے راستوں سے، نئے موڑ سے سب کے سب ہیں گزرتے

ہر ایک موڑ پر جیسے کوئی کھڑا ہو، اشاروں میں کچھ کہہ رہا ہو
سمجھ میں نہ آئے کوئی بات اُس کی مگر جیسے چشمہ سا اک بہہ رہا ہو

کوئی جیسے بیٹھے مدھر گیت کے بول مدھم سروں میں یونہی گنگنائے
کوئی جیسے طوفاں دبائے ہو دل میں، کسی سے مگر پھر بھی کچھ کہہ نہ پائے

کچھ الفاظ ایسے جو یوں دیکھنے میں پرانے سے ہیں اور کتنے ہی انساں
انھیں کے سہارے سے کہتے رہے ہیں دلوں کی مرادیں، جوانی کے ارماں

یہ ارمان، یہ آرزوئیں ہماری، یہ کچھ رسمساتے ہوئے پھول جیسے
جگائیں جنھیں آکے جھونکے ہوا کے، جنھیں گدگدا جائیں آ آ کے بھنورے

خزاں کی ہواؤں کے چلنے سے پہلے، ٹپکتے ہوئے پھول کے رس میں ڈوبا
کوئی گیت سا بن لیا ہے بہاروں نے گاتے ہیں اب بھی جسے باغ و صحرا

جو کنجِ محبت[1] میں پیڑوں کی چھنتی ہوئی چاندنی کی زباں سیکھے کہتا
کہو آج کی رات کیسی گزاری؟ کوئی آج کی رات ملنے بھی آیا

بہار کی واپسی

میں چپ چاپ بیٹھا ہوں اس رہگزر پر
یہی سوچتا ہوں کہ خط لانے والا
کہیں آج بھی کہہ نہ دے کچھ نہیں ہے
یہ کیا بات ہے لوگ اک دوسرے سے
جدا ہو کے یوں جلد ہیں بھول جاتے
وہ دن رات کا ساتھ، ہنسنا ہنسانا
وہ باتیں جنھیں غیر سے کہہ نہ پائیں

اچھوتے سے الفاظ جو شاہراہوں پہ
آتے ہوئے دیر تک ہچکچائیں
کچھ الفاظ کے پھول جو اس چمن میں
کھلے تھے جسے محفلِ دوش کہیے
جو کچھ دیر پہلے ہی برہم ہوئی ہے
چراغوں سے اب تک دھواں اٹھ رہا ہے
درو بام پر اب بھی پھیلی ہوئی ہے
ہر اک سمت صہبائے احمر کی خوشبو
ہوا میں ابھی شور ہے ہاؤ ہو، کا
وہ اڑتے ہوئے کاگ کے قہقہوں سے
الجھتے ہوئے زمزمے بوتلوں کے
بناتے ہیں دیوار پر کتنے دھبے
ابھی ہنس رہے ہیں، ابھی بولتے ہیں
مری داستانوں کے دلچسپ کردار
سنسان گلیوں کے رنگین قصے
یہ سب میرے پیچھے چلے آرہے ہیں
کوئی جیسے روٹھے ہوئے آدمی کو
منائے، بڑے پیار سے تھپتھپائے
دلائے کوئی یاد گزری ہوئی بات
ہاتھوں کو اس کے دبا کر کہے
دیکھنا دیکھنا کوئی انجان راہی ہے
یا لڑکھڑاتا ہوا کوئی پتہ
خزاں کے پروں پر اُڑا آرہا ہے
کوئی نامۂ شوق لے آرہا ہے
ترے شہرِ سرودسمن کے گلوں نے

خود اپنے ہی ہاتھوں سے تجھ کو لکھا ہے
چلے آؤ اب عہدِ گل آ گیا ہے

اپنی یاد

مرا شہر، میرے جنوں کے دیار
مرے جانے پہچانے سے راستے
ہر اک آنے والے سے ہیں پوچھتے
انھیں جانتے ہو؟ وہ کب آئیں گے؟
یہ کہنا کہ ہے راہ تکتی ابھی
وہ خوشبو میں ڈوبی ہوئی چاندنی
وہ آنکھوں کی کھوئی ہوئی روشنی
وہ گہرے اندھیرے، وہ سینے کے داغ
وہ جلتے ہوئے آنسوؤں کے چراغ
ہر اک موڑ پر مجھ کو ہیں ڈھونڈتے
ہر اک چہرے کو غور سے دیکھتے
ہر اک شخص سے نام لے کر مرا
یہ کہتے ہیں ان کا بتادو پتا
کوئی میرا ہم شکل مل جائے تو
بلاتے ہیں، کہتے ہیں سنئے ذرا
یہ کیوں آپ لگتے ہیں افسردہ سے؟
ہیں کیوں آپ کچھ کچھ پریشان سے؟
کوئی چیز کیا آج کھوئی گئی؟
کوئی قیمتی شے کہیں گر گئی؟
کوئی آئینہ قدِ آدم ملا؟
یہ کیوں آپ کو اپنی یاد آ گئی؟

سورج مکھی کا پھول

سورج مکھی کے پھول کی یہ تصویر بہت ہی پیاری ہے
اس کو بیٹھا بیٹھا جانے کتنی دیر تکا کرتا ہوں

میری طرح اس کے سینے میں رات کے گہرے زخم لگے ہیں
میری طرح یہ بھی رویا ہے چھپ چھپ کر تنہائی میں
شبنم کے ہر نرمل موتی کو پلکوں سے اٹھایا ہے
پچھلے پہر کے سناٹے کو یوں چھاتی سے لگایا ہے
جیسے امرت جان کے کوئی زہر کے پیالے کو پی جائے
میری طرح یہ بھی جاگا ہے آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹے ہیں
دھیرے دھیرے رینگنے والے فرقت کی راتوں کے لمحے
میری طرح یہ بھی دیوانہ ہے اک چمکتے چہرے کا
میری طرح یہ بھی متوالا ہے اک موہن سے مکھڑے کا
میری طرح سے یہ بھی ملن کی گھڑیاں گنتا رہتا ہے
میری طرح سے یہ بھی مل کر کچھ بیکل سا رہتا ہے
میری طرح سے اس کی چاہت میں بھی کوئی مجبوری ہے
میری طرح سے اس کے وصل میں اک دردِ مہجوری ہے

مجھ کو کچھ ایسا لگتا ہے میری ہی تصویر ہے یہ
میرے گھائل سے گیتوں کی مبہم سی تفسیر ہے یہ

میرے خوابوں کی سرزمیں

کہاں کہاں لے کے پھر رہا ہوں میں اپنے خوابوں کی سرزمیں کو
نہ جانے کیوں اس کو مجھ سے الفت ہے، یہ مجھے چھوڑتی نہیں ہے

یہ میری چھاتی سے لپٹی رہتی ہے جیسے ماؤں سے ان کے بچے
میں ایک آوارہ گرد، ناکام، اپنی ہی تشنگی کا مارا
پھرا کیا ہوں گلی گلی میں، ہر ایک قریے کو چھان مارا
ہر ایک رستے پر میرے پاؤں کے آبلے خون رو چکے ہیں
ہر ایک دریا کے پاس جاجا کے میں نے پھیلائے ہاتھ اپنے
یہ گڑگڑا کر کہا کہ میرے گلو میں کانٹے چبھے ہوئے ہیں
خدارا کچھ رحم کھاؤ، ٹپکا دو بوند بھر میرے منہ میں پانی
بڑے بڑے جگمگاتے شہروں میں اونچی اونچی عمارتوں کے
قریب ہی بیٹھ کر گزاری ہیں جاگ کر ایسی کتنی راتیں
خدا نے اک ''برف کے جہنم'' میں جس کے بدلے میں مجھ کو ڈالا
کبھی کبھی بھیک مانگنے کو لیے ہوئے آنسوؤں کی جھولی
تکا کیا ہوں حریر و اطلس کے دیوتاؤں کی سمت جیسے
یہ گر مرا حال پوچھ لیں گے تو بخش دیں گے مجھے خدائی
مگر مرا ایک لفظ سنتے ہی ان کے کانوں میں جیسے کوئی
پلادے پگھلا ہوا سا سیسہ، مجھے دکھائی دی ایک تختی
''یہاں کوئی نوکری نہیں ہے'' یہاں پہ جو شے بھی ہے وہ دائم
جگہ سے ہٹتی نہیں ہے اپنی،کوئی بھی کرسی نہیں ہے خالی
پڑا رہا ہوں میں اپنے بستر پہ، ایک ٹوٹے سے جھونپڑے میں
مرا بدن جیسے کوہ آتش فشاں کے مانند پھوٹتا ہو
ہر ایک لمحے پہ نبض جیسے کہ آخری بار کی ہو دھڑکن
میں چاپ سنتا تھا ایسے قدموں کی جیسے سب قرض خواہ میرے
مرے سرہانے کھڑے ہوں، کہتے ہوں سود در سود چڑھ رہا ہے
ہمیں تو کچھ اور کیا ہے لینا مگر تم اپنی ہی زندگی میں
نجات پاجاؤ تاکہ مرنے پہ آتما ہو سکھی تمھاری
مگر جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ میرے خوابوں کی کوئی دلہن
مجھے جگاتی ہے موت کی نیند سے، مجھے پیار کررہی ہے

یہ کہہ رہی ہے کہ چھوڑ کر مجھ کو کیا کہیں اور جا رہے ہو
ابھی اجازت نہ دیں گے تم کو، تمھارے یہ رشتہ دار سارے
تمھارے یہ کھیت جن میں سونا بچھا ہے، فصلیں کھڑی ہوئی ہیں
ہر ایک خوشے میں بس رہی ہے حسیں، دلآویز و مست خوشبو
پکے ہوئے تازہ تازہ میووں سے ڈالی ڈالی لدی ہوئی ہے
تمام چڑیاں تمھارا ہی نام لے کے اک گیت گا رہی ہیں
ندی کے پانی میں اپنے چہروں کو دیکھتے ہیں تمھارے بچے
تمھارے مدھوبن میں شیام کی بنسری پہ رادھا کی ساری سکھیاں
ملن کی آشا لیے ہوئے اپنے گھنگھرو سنبھالتی ہیں
ابھی نہ جاؤ تمھاری بستی میں لوگ ہنستے ہیں، بولتے ہیں
ابھی نہ جاؤ تمھارے اس دیس پر کوئی بم نہیں گرا ہے

سفرنامہ

میری پریشاں حالی مجھ کو کون سے شہر میں لے آئی ہے
ساری سڑکیں، ساری دُکانیں مجھ کو غور سے دیکھ رہی ہیں
میرے چہرے کو تکتی ہیں جیسے اس پر کچھ لکھا ہو
ساری نگاہیں پوچھ رہی ہیں کس کو ڈھونڈنے آئے ہو؟
کوئی تمھارا جاننے والا گھر سے روٹھ کے بھاگ آیا ہے؟
اس کی شکل و شباہت کیا ہے؟ کیا ہے اس کا چہرہ مہرہ؟
کپڑوں کی کیا وضع ہے اس کے؟ کون سے رنگ کا ہے دلدادہ؟
لمبے لمبے بال ہیں اس کے، آنکھیں اس کی چمکیلی ہیں
سگریٹ سے بھی شوق ہے اس کو اچھی چائے کا بھی رسیا ہے
ایک ذرا سی آہٹ ہو تو اس کی نیند اُچٹ جاتی ہے
کھلی ہوا، شفاف فضا میں سیر کو جایا کرتا ہے

چاندنی راتوں میں کوٹھے کی چھت پہ ٹہلتا رہتا ہے
بستر پر جانے سے پہلے نئے رسالے پڑھتا ہے
شعر و ادب میں کھوئے کھوئے رہنے کا بھی چسکا ہے
کبھی کبھی راتوں کو اٹھ کر خود بھی لکھتا رہتا ہے
لمبے لمبے خط لکھتا ہے بیٹھ کے اکثر تنہائی میں
اس کے سر میں عشق و محبت کا بھی کچھ کچھ سودا ہے
کوئی اس کو سمجھائے تو یونہی ہنستا رہتا ہے
بے پرواسا من مانا سا کچھ اچھا سا لگتا ہے
ہاں وہ یہیں آیا ہے، اس کو ہم نے اکثر دیکھا ہے
لیکن اب تو شاید اپنے آپ کو بھی وہ بھول چکا ہے
تم کیا اس کو ڈھونڈ سکو گے؟ تم کیا اس کو پہچانو گے؟
جاؤ جلدی واپس جاؤ ورنہ تم بھی کھو جاؤ گے

آدمیوں کے میلے

وہی شام رنگیں، وہی شہر خوباں، وہی جگمگاتے ہوئے راستے ہیں
وہی روشنی ہے، وہی قہقہے ہیں، وہی شور و غل ہے، وہی چہچہے ہیں
اُسی طرح سے قافلے آ رہے ہیں، اسی طرح پرچھائیاں ہل رہی ہیں
اُسی طرح سایوں سے سرگوشیاں ہیں، اُسی طرح کچھ آہٹیں مل رہی ہیں
اُسی طرح ملتے ہیں شانوں سے شانے، اُسی طرح چھوتی ہیں باہوں کو باہیں
اُسی طرح رُک رُک کے کچھ دیکھتی ہیں، ہر اک موڑ پر ڈھونڈتی ہیں پناہیں
ہر اک شخص کا جیسے اپنا ہی ساتھی، کوئی اپنا ہی آدمی کھو گیا ہو
ہر اک چہرے کو غور سے تک رہا ہو، ہر اک آنکھ سے جیسے کچھ پوچھتا ہو
کہیں بھیڑ میں تم نے دیکھا ہے اُس کو؟ کوئی میری خاطر پریشان سا ہے؟
کسی کی زباں سے سنا نام میرا؟ کوئی مجھ کو بھی پوچھتا پھر رہا ہے؟

کوئی شکل ایسی بھی دیکھی ہے تم نے جو میرے لیے ہی یہاں کھوگئی ہو
جو یوں دیکھنے کو تو دیکھے سبھی کو مگر صرف مجھ کو ہی پہچانتی ہو

اپنی تصویر سے

کہو دوست! کچھ تو کہو چپ سے کیوں ہو
بڑی دیر سے مجھ کو یوں تک رہے ہو
میں جیسے کوئی اور ہوں اجنبی ہوں
مرا نام تک تم نہیں جانتے ہو
ذرا غور سے میری آنکھوں میں جھانکو
تمھیں اس میں صورت کسی آدمی کی
ملے گی، جو تم سے کئی بار پہلے
ملا ہے، تمھیں خوب پہچانتا ہے
تمھاری کئی یادگاروں کو اس نے
لگا رکھا ہے اپنے سینے سے جیسے
تمھارے علاوہ ہر اک شخص سے
اس کی بس دور کی جان پہچان ہے
تم کو شاید نہ ہو یاد لیکن اسے
ساری باتیں تمھاری ابھی یاد ہیں
اس کو وہ دن بھی ہیں یاد جب تم کبھی
روتے رہتے تھے اٹھ اٹھ کے پچھلے پہر
مانگتے تھے خدا سے دعا موت کی
تم نے چھپ چھپ کے جتنے بھی لکھے ہیں خط
کہہ رہا ہے کہ سب مجھ کو معلوم ہیں
ان کا ایک ایک فقرہ مجھے یاد ہے

تم نے جو باتیں خلوت میں محبوب سے
کی تھیں جن کا کسی اور کو کیا پتہ
وہ یہ کہتا ہے میں سن چکا ہوں انھیں
ان کا ایک ایک لفظ، ان کا ایک ایک حرف
آج تک ذہن میں میرے محفوظ ہے
اس کے پاس ایسی چیزیں بھی محفوظ ہیں
جو تمھاری ہیں لیکن کہیں رکھ کے تم
بھول بیٹھے تھے اور ڈھونڈنے پر جنھیں
تم نہیں پاسکے اور چپ ہو رہے
کہہ رہا ہے کہ آیا ہے وہ اس لیے
اب تمھاری یہ چیزیں تمھیں سونپ دے

متھلا دیس

کچھ خوشبوئیں بھینی بھینی متھلا دیس سے لایا ہوں
میرے سانولے گیتوں میں بھی اس دھرتی کی نرمی ہے
جن لفظوں کو اب چھوتا ہوں ان میں رس آجاتا ہے
میرے بن میں بیٹھ کے جیسے مُرلی کوئی بجاتا ہے
میرے سر کی دھوپ کے اوپر آج کدم کے سائے ہیں
میری راہ میں جیسے کسی نے پیار کے پھول بچھائے ہیں
ہرے بھرے جنگل کی وسعت ان آنکھوں میں سمائی ہے
میرے سپنوں کے آنگن میں اودی اودی گھٹا چھائی ہے
میرا تصور جیسے ندی کا دھیما دھیما بہتا پانی
میرے خیالوں کی آہٹ میں جیسے جل پریوں کی کہانی
میرے غم کے پہاڑوں سے اک میٹھا چشمہ بہہ نکلا ہے

میری جلتی پیشانی کو جیسے کسی نے چوم لیا ہے
جب بھی نظمیں لکھتا ہوں یہ نگری مجھ کو بلاتی ہے
راتوں کی تنہائی میں آواز سی جیسے آتی ہے
تم بھی میرے وِدّیا پتی ہو، میری آنکھ کے تارے ہو
تم بھی میرے من موہن ہو، میرے راج دُلارے ہو

بوئے آوارہ

○

کچھ ان کی باتیں، کچھ اپنی باتیں
کٹتی ہیں یونہی اب غم کی راتیں

جانے یہ دن پھر آئیں نہ آئیں
کچھ اور اشارے، کچھ اور گھاتیں

کچھ لے گئے وہ، کچھ دے گئے وہ
کوئی نہ سمجھا آنکھوں کی باتیں

چپ کے سوا اب چارہ ہی کیا ہے
گزری ہیں دل پر کچھ وارداتیں

وہ جیت کر بھی کچھ خوش نہیں ہیں
اب ان کی خاطر کچھ اور باتیں

سن لو کہ شاید نہ پھر سن سکو گے
کہنی ہیں تم سے کچھ ایسی باتیں

○

تمھارے پاس اک وحشی نے یہ پیغام بھیجا ہے
کہ اب ہجراں نصیبوں کو بھلا دینا ہی اچھا ہے

جنوں میں یوں تو کچھ اپنی خبر ملتی نہیں ہم کو
اک ایسا نام ہے جس پر ابھی تک دل دھڑکتا ہے

یہ مانا سخت ہے یہ وادیٔ غربت کی تنہائی
مجھے رہنے دے اے ہمدم یہیں اب جی بہلتا ہے

دلِ ناداں کو راس آئی تمھاری کج ادائی بھی
تمھاری بے وفائی میں بھی اک عالم نکلتا ہے

یقیں آکر دلاتے ہیں مجھے یہ قافلے والے
ذرا کچھ اور آگے کوچۂ جاناں کا رستا ہے

جو وہ ہیں جانِ محبوبی تو کتنے بوالہوس ٹھہرے
چمن کی تیرگی میں اور بھی وہ گل سنورتا ہے

اسیرانِ قفس پھر چونک اٹھے شور بہاراں سے
نہ جانے گل کھلے کیا آج صیادوں میں چرچا ہے

عجب کیا ہے زمانہ جاگ اٹھے اک تیری آہٹ سے
نسیمِ صبح کا کروٹ بدلنا کس نے دیکھا ہے

حریفوں کو ہے ناحق رشک میری عشق بازی پر
جہاں میں کون ہے جو مجھ سے بڑھ کر آج رسوا ہے

O

ہزار طرح سے گردش میں آفتاب رہا
نگاہِ ناز کا لیکن کہاں جواب رہا

وہ آگئے ہیں تو اب چھوڑ دو اس فسانے کو
کہاں کہاں میں پھرا کس طرح خراب رہا

سنا رہا ہوں انھیں جھوٹ موٹ اک قصہ
کہ ایک شخص محبت میں کامیاب رہا

اگرچہ اور بھی فتنے اٹھے قیامت کے
ترا شباب ہی عالم میں انتخاب رہا

رہِ حیات میں ہم چاک دل سے دیکھیں گے
جہاں جہاں بھی رُخِ دہر پر نقاب رہا

○

دل کے ہر داغ پہ شعلے کا گماں ہوتا ہے
نگہِ ناز پہ اب کوئی اثر ہو کہ نہ ہو

لے سنبھال اب مرے اشکوں کو اندھیرا ہے بہت
بزمِ افلاک میں اب کوئی گہر ہو کہ نہ ہو

مجھ کو رُسوا کرو کچھ اور کہ میرے غم کی
کسی بیگانۂ الفت کو خبر ہو کہ نہ ہو

رنگ لایا تو ہے اک قطرۂ شبنم کا گداز
دل افسردہ میں اب کوئی شرر ہو کہ نہ ہو

تیری محفل میں ہیں بیٹھے یہ شرف کیا کم ہے
ہم پہ اب کوئی عنایت کی نظر ہو کہ نہ ہو

دشتِ غربت سے چلی لے کے تو اے یادِ وطن
ہائے وہ میرا اک اُجڑا ہوا گھر ہو کہ نہ ہو

○

بس گئی دل میں کسی کی رعنائی
آج تک مل سکی نہ تنہائی

بارہا تیرے نامرادوں کو
موت آواز دے کے پچھتائی

ایسی راتیں بھی ہم پہ گزری ہیں
تیرے پہلو میں تیری یاد آئی

جس جگہ جا کے پھر قدم نہ اٹھیں
وہیں لے چل ہوائے صحرائی

دوستو مجھ کو سنگسار کرو
اب بھی اُس بت کا ہوں میں سودائی

مجھ سے سرکش کا سر جہاں جھک جائے
اس کو زیبا ہے نازِ یکتائی

وہی دنیا میں اک حسین نہیں
پھر بھی مت پوچھ اس کی زیبائی

دل مٹا بھی تو سادگی پہ مٹا
ہائے رنگینیوں کے شیدائی!

O

نہ اب اور عشقِ سادہ کو اسیرِ رنگ و بو کر
ترے حسن کا ہوں قائل مرے دل کی گفتگو کر

یہ نقاب روئے جاناں، یہی عشق کا گریباں
اسے چاہے چاک کر دے، اسے چاہے اب رفو کر

کہاں چونکتے تھے وحشی، تھی سبک ہوائے گل بھی
مگر اب کی بار آئی ترے پیرہن کو چھوکر

تجھے کام کا بنا دے نہ اگر تو مجھ سے کہنا
یہ عجیب شے ہے واعظ! کبھی مے سے بھی وضو کر

جنھیں بزم سے اٹھا کر تجھے اب ہوئی ندامت
وہ یہیں کہیں ملیں گے ذرا ان کی جستجو کر

ترے ہونٹ ہی کی پی کر میں بہت بہک اٹھا ہوں
ہے اسی میں خیر ساقی! کہ نہ شرحِ آرزو کر

O

الٰہی آ نہ پڑے پھر کوئی غمِ تازہ
اُڑا اُڑا سا ہے روئے نگار کا غازہ

ابھی تو کتنے ہیں جن پر حرام ہے ساقی!
کہیں یہ توڑ نہ دیں میکدے کا دروازہ

اب انقلاب کی زد میں ہے تیری دنیا بھی
بہت بچا کے تو دامن چلی تھی طنازہ

یہ ایک قطرۂ خون مرکز دوعالم ہے
تمھیں نہیں ہے دلِ ناتواں کا اندازہ

بھری بہار میں یہ میری چاک دامانی
نہ جانے کب کا اٹھانا پڑا ہے خمیازہ

O

ترے رندوں نے کر ڈالے ہیں ٹکڑے آبگینے کے
سکھا دے اب کوئی آ کر انھیں آداب پینے کے

یہ دنیا ہم کو کیا دے گی مگر تیری محبت میں
بہانے مل ہی جاتے ہیں ہمیں اک بار جینے کے

مسرت کیا ملی ہاں آج پابندِ مسرت ہیں
کوئی اے کاش دے دیتا ہمیں غم ہی قرینے کے

غمِ جاناں میں کتنوں کا لہو پانی ہوا لیکن
جبینِ دہر پر بھی آج قطرے ہیں پسینے کے

کوئی طوفان ہی اٹھے، کوئی سیلاب ہی آئے
کسی صورت سے دن پھر جائیں قسمت کے سفینے کے

فضائے عارض و کاکل میں بھی اب جی نہیں لگتا
ارے یہ تو فسانے ہیں وہی مکّے مدینے کے

O

کیسی یہ رسم ہے، یہ کیسا چلن ہے صیاد!
آج پھر سر پہ وہی چرخِ کہن ہے صیاد!

آشیاں میرا نہیں، لالہ و گل میرے نہیں
کیسے کہہ دوں کہ یہی میرا چمن ہے صیاد!

عندلیبوں پہ تو پڑتے ہیں چمن میں پہرے
اور چہکتا ہوا ہر زاغ و زغن ہے صیاد!

کاش اک قطرۂ شبنم ہی کوئی ٹپکا دے
تلملایا سا ہر اک غنچہ دہن ہے صیاد!

جانے اب گردشِ ایّام یہ کیا بیتے گی
آج دیوانوں کی ابرو پہ شکن ہے صیاد!

زخم کھا کھا کے سنورتی ہی چلی جاتی ہے
میری دنیا نہیں یہ کوئی دُلہن ہے صیاد!

ڈھل چکی رات، وہ پو پھٹنے ہی والی ہے
یہ نئی صبح نہیں تیرا کفن ہے صیاد!

ٹوٹ کر پاؤں کی زنجیر گری جاتی ہے
اک نئے رقص میں اب سارا چمن ہے صیاد!

○

نشاطِ زندگی میں ڈوب کر آنسو نکلتے ہیں
سنا ہے اب ترے غم کے نئے پہلو نکلتے ہیں

محبت کا چمن ہے آؤ سیرِ سرسری کرلیں
یہاں سے لے کے سب ٹوٹے ہوئے بازو نکلتے ہیں

جنوں لے کر چلا ہے پابجولاں اس کے کوچے سے
لیے آغوش میں ہم نکہتِ گیسو نکلتے ہیں

تری بستی میں دیوانوں کو رسوائی ہی راس آئی
یہ اپنا چاک دامن لے کے اب ہر سو نکلتے ہیں

وہی عارض، وہی کاکل، وہی کافر ادا آنکھیں
مگر ہر لحظہ پھر بھی کچھ نئے جادو نکلتے ہیں

محبت میں انھیں کو جان دے دینا بھی آتا ہے
وہ جن کے واسطے لے کر خمِ ابرو نکلتے ہیں

○

یہ غم نہیں کہ آج ترا آستاں نہیں
مجھ کو دماغ خندۂ اہلِ جہاں نہیں

یہ سچ ہے آج بھی ہے مجھے زندگی عزیز
لیکن جو تم ملو،تو یہ سودا گراں نہیں

جانے دو اب تو چاک گریباں کی بحث کو
میرے چمن میں کوئی بہار و خزاں نہیں

شامِ فراق صبحِ قیامت سے مل گئی
اب غم کی سرزمیں پہ کوئی آسماں نہیں

اک تم کہ پاس رہ کے بھی کچھ دور دور تھے
اک میں کہ تم سے چھٹ کے بھی کچھ بدگماں نہیں

○

وہ ہم صفیر تھے تو قفس بھی چمن ہی تھا
اب جیسے آشیاں بھی مرا آشیاں نہیں

میرے جنون پہ ان کو خلش سی ضرور ہے
یہ اور بات ہے کہ وہ کچھ مہرباں نہیں

سب ناامید ہو کے زمانے سے جا ملے
اہلِ وفا کا آج کوئی رازداں نہیں

کیسی بہار، کیسا چمن، کیسا میکدہ
میرا لہو بھی پی کے یہ دنیا جواں نہیں

ہم اہلِ غم کے پاس دلِ خونچکاں تو ہے
تم کو سنائیں حال وہ طرزِ بیاں نہیں

ناصح کی ضد پہ چرخ کو لانا تھا راہ پر
کیسے کہیں کہ سعیِ جنوں رائیگاں نہیں

○

بہت اُکتا گیا ہے جی خردمندوں کی صحبت سے
کوئی دیوانہ ہاتھ آیا نہیں ہے ایک مدت سے

بنامِ ہجر اب اک جام دے کچھ تیز تر ساقی
فسردہ ہو چلے ہیں اہلِ دل صہبائے عشرت سے

ہمیں تو جاگنا ہے وصل ہو یا ہجر جو کچھ ہو
یہ ظالم رات مل جاتی تو ہے ان کی عنایت سے

نکل آئیں گے اب بھی کتنے پہلو آشنائی کے
بچائے کون دل کو ان نگاہوں کی سیاست سے

گلے ان کو لگایا ہے کبھی ہونٹوں کی مے پی ہے
نہیں واقف ہوں میں اے دوستو کفرانِ نعمت سے

یہاں تو اعظمی جیسے خراباتی بھی آپہنچے
مجھے ڈر ہے کہیں زاہد چلا جائے نہ جنت سے

○

ہر ذرّہ گلفشاں ہے، نظر چور چور ہے
نکلے ہیں میکدے سے تو چہرے پہ نور ہے

ہاں تُو کہے تو جان کی پروا نہیں مجھے
یوں زندگی سے مجھ کو محبت ضرور ہے

اب اے ہوائے چرخِ کہن تیری خیر ہو
اٹھنے کو اس زمین سے شورِ نشور ہے

اپنا جو بس چلے تو تجھے تجھ سے مانگ لیں
پر کیا کریں کہ عشق کی فطرت غیور ہے

نازک تھا آبگینۂ دل ٹوٹ ہی گیا
تو اب نہ ہو ملول ترا کیا قصور ہے

عارض پہ تیرے میری محبت کی سرخیاں
میری جبیں پہ تیری وفا کا غرور ہے

○

جب کبھی آیا تو ذکرِ مئے گلفام آیا
کفر آیا ترے رندوں کو نہ اسلام آیا

پھر کہاں بھاگ کے جائیں گے یہ تیرے وحشی
گر تری زلف کے سائے میں نہ آرام آیا

ہم تو برباد تھے، برباد ہی ہونا تھا ہمیں
کیوں تری چشمِ عنایت پہ یہ الزام آیا

سی لیے ہونٹ کہ اندیشۂ رسوائی تھا
پھر بھی ہر سانس میں چھپ چھپ کے ترا نام آیا

بات تو جب ہے، بنے آج کوئی میرا حریف
عشق میں جان گنوادینے کا ہنگام آیا

میکدے سے جو چلے دار و رسن تک پہنچے
آج یہ پی کے بہکنا بھی بہت کام آیا

○

جس کی چاہت میں مٹے در در ہوئیں رسوائیاں
پھر اسی کے نام پر آنکھیں مری بھر آئیاں

کب تک آخر اُس کی زلفوں سے ملاؤں سلسلہ
اے شبِ ہجراں تری بڑھتی ہوئی لمبائیاں

ہو سکے تو رشتۂ امید بھی اب توڑ دو
راس آجائیں گی پھر مجھ کو مری تنہائیاں

دوستو تم کو مبارک ہو یہ رسمِ احتیاط
میرے کام آئی ہیں لیکن میری بے پروائیاں

میکدہ لوٹا گیا، وہ عہدِ گل رخصت ہوا
پھر رہی ہیں پھر بھی نظروں میں وہی پرچھائیاں

دل کی ہر ہر چوٹ ابھری ہے نئے انداز سے
کس کی یاد آئی ہے، یہ کیسی چلیں پروائیاں

عشق کی قسمت یہی ہے اس کو ہونا ہے خراب
تم پھلو پھولو یونہی بڑھتی رہیں رعنائیاں

اعظمی صاحب! ذرا بچ کر یہ کوئے یار ہے
اس کے ہر ہر موڑ پر ملتی ہیں سو سو کھائیاں

○

ہم اہلِ غم بھی رکھتے ہیں جادو بیانیاں
یہ اور بات ہے کہ سنیں لن ترانیاں

شرمندہ کر نہ مجھ کو مرا حال پوچھ کر
لے دے کے رہ گئی ہیں یہی بے زبانیاں

کم کیا تھا ہم فقیروں کو آشوبِ روزگار
کیوں یاد آرہی ہیں تری مہربانیاں

دامن کے چاک چاک میں ہے موسمِ بہار
آؤ کہ خونِ دل سے کریں گلفشانیاں

اہلِ زمانہ تم بھی بڑے وقت پر ملے
کچھ بار ہو چلی تھیں مری شادمانیاں

تم نے بھلا دیا تو نئی بات کیا ہوئی
رہتی ہیں یاد کس کو وفا کی کہانیاں

جی کھول کر لٹائیں گے اب تیری راہ میں
تیرے بلاکشوں کو ملی ہیں جوانیاں

رکھ لو کہ زندگی میں کبھی کام آئیں گی
دیوانگانِ عشق کی بھی کچھ نشانیاں

O

وہ گھڑی، وہ رُت گئی، وہ دن گئے موسم گئے
ساتھ اک جانِ وفا کے کتنے ہی عالم گئے

وہ گئے تو اور پھر کوئی نہ ان سا مل سکا
وادی وادی ہم پھرے، پورب گئے، پچھم گئے

آس ٹوٹی دل کی یا کوئی نیا وعدہ ہوا
اے شبِ غم کیا ہوا کیوں میرے آنسو تھم گئے

ایک ہم جو تجھ سے چھٹ کر بھی ترے در کے رہے
ایک وہ جو بزم میں رہ کر بھی نامحرم گئے

آج سے خوش رہ کے بھی دیکھیں گے تیرے غم نصیب
تیری مرضی ہے تو لے آہیں گئیں، ماتم گئے

ان بہاروں نے جلایا ہے ہمارا آشیاں
اب نہ روک اے موجِ گل، اب اس چمن سے ہم گئے

O

اپنا ہی شکوہ، اپنا گلا ہے
اہلِ وفا کو کیا ہوگیا ہے

ہم جیسے سرکش بھی رو دیے ہیں
اب کے کچھ ایسا غم آپڑا ہے

دل کا چمن ہے مرجھا نہ جائے
یہ آنسوؤں سے سینچا گیا ہے

ہاں فصلِ گل میں رندوں کو ساقی
اپنا لہو بھی پینا پڑا ہے

یہ درد یوں بھی تھا جان لیوا
کچھ اور بھی اب بڑھتا چلا ہے

بس ایک وعدہ اور وہ بھی کم بخت
مرمر کے جینا سکھلا گیا ہے

جرمِ محبت مجھ تک ہی رہتا
ان کا بھی دامن الجھا ہوا ہے

اک عمر گزری ہے راہ تکتے
جینے کی شاید یہ بھی سزا ہے

دل سرد ہوکر ہی رہ نہ جائے
اب کے کچھ ایسی ٹھنڈی ہوا ہے

○

مرے سازِ غم پہ چھیڑو نہ یہ نغمۂ بہاراں
مجھے راس آگیا ہے یہ لباسِ سوگواراں

کہیں زخم بھر نہ جائے، کہیں تو نہ بھول جائے
یہی سوچ کر فسردہ ہیں ترے جگر فگاراں

ہمیں اب شراب دینا تو سمجھ سمجھ کے ساقی!
کہیں پھر نہ سر اٹھائے یہ ہجوم بادہ خواراں

مجھے قتل کر کے سیکھے ہیں وہ رسمِ دردمندی
ہیں بڑے ہی بھولے بھالے یہ مرے جفاشعاراں

تری رہ میں سر کٹا کر مجھے کچھ سکوں ملا ہے
کہ مرے جنوں سے ٹوٹا ہے غرورِ شہریاراں

ذرا ان کے واسطے بھی کبھی گیسوؤں کا سایہ
کہ ابھی بھٹک رہے ہیں ترے تیرہ روزگاراں

ابھی آسکو تو آؤ، ابھی رات کچھ ہے باقی
ابھی جھلملا رہی ہے یوں ہی شمعِ رہگواراں

مجھے کچھ ہوا نہیں ہے یونہی پھٹ گیا گریباں
مجھے دیکھ دیکھ سوچو نہ کچھ اور غمگساراں

○

خوار ہوئے، بدنام ہوئے، بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے

ایک جگہ کب دل کی وحشت ہم کو ٹھہرنے دیتی تھی
اس کوچے میں آکر لیکن کچھ ہم بھی مجبور ہوئے

تجھ بن کس کس میخانے میں جا کے بھٹکتے پھرتے تھے
تیری ایک نظر پڑتے ہی سارے شیشے چور ہوئے

بات تو کوئی ہوگی مگر مت پوچھو اے یارانِ وطن
اپنے گھر کو چھوڑ کے کیوں ہم دیوانے مسرور ہوئے

دور کی اک تشبیہ خرامِ ناز سے تیرے دے دی تھی
میرے غزالاں اور بھی چونکے اور بھی کچھ مغرور ہوئے

تجھ سے کم کم واقف تھے تو روز کا ملنا ہوتا تھا
تجھ کو جانا، تجھ کو چاہا، وقفِ شبِ دیجور ہوئے

دل ٹوٹا پر ہم سے نہ یہ زنجیرِ تعلق ٹوٹ سکی
صحرا صحرا گھوم کے بھی کب تیرے در سے دور ہوئے

ترکِ محبت بھی کر دیکھیں حال ہمارا کیا ہوگا
اُس کی ایک جدائی پر تو رگ رگ میں ناسور ہوئے

کون تری زلفوں کو چھیڑے، کون گلابی چھلکائے
تیری گلی سے ہم کیا نکلے سب جلوے مستور ہوئے

ہائے وہ کالی کالی آنکھیں، ہائے وہ بھیگے بھیگے ہونٹ
ہائے وہ تیرے چاہنے والے جو پی کر مخمور ہوئے

میرؔ کے رنگ میں شعر کہے ہے تجھ کو یہ کیا سودا ہے
اعظمیؔ! اس سورج کے آگے کتنے دیپے بے نور ہوئے

○

لے چلو اب نہ ہمیں پاپ کی دنیا کی طرف
ہم تو دیوانے ہیں، ہم جاتے ہیں صحرا کی طرف

ہم کو معلوم تھا انجامِ محبت ناصح!
کیا کریں دل ہے کھنچا حسنِ دلآرا کی طرف

چاہے اب نجد کا ہر ذرّہ مخالف ہوجائے
قیس ہیں ہم تو بہرحال ہیں لیلیٰ کی طرف

ہم کو کچھ اور بھی یاد آئے گی وہ چشمِ خراب
ہم نہ اب جائیں گے پیمانہ و صہبا کی طرف

تیرے بیمار ہوئے اپنا نصیبہ جاگا
کفر ہے دیکھیں جو اعجاز مسیحا کی طرف

ابھی بت خانوں میں کچھ اور بھٹک لیں ناشاد[1]!
زندگی ہے تو چلیں گے کبھی کعبہ کی طرف
(22فروری1953)

○

بہت پیچھے رہے جاتے ہیں اپنے اور بیگانے
یہ کس دُھن میں، یہ کس جانب چلے ہیں آج دیوانے

قسم کھائی تھی جن کے نام کی سارے غزالوں نے
ستم ہے راس ان کو بھی نہ آئے تیرے ویرانے

ہمیں زخمِ محبت لے کے اس کوچے سے جاتے ہیں
سلامت انجمن تیری، سلامت تیرے میخانے

متاعِ دردمنداں اور کیا اس دشت غربت میں
نگاہِ مہرباں اک بار جو آئی تھی سمجھانے

تری محفل سے رسوا ہو کے اٹھے ہیں تو سوچا ہے
جہاں میں اس طرح گم ہوں کہ اب کوئی نہ پہچانے
(مدراس،فروری1953)

○

بہت فسردہ ہیں ان کو کھوکر جگر فگاروں سے کچھ نہ کہنا
نہ جانے کیا ان کے دل پہ بیتے گی سوگواروں سے کچھ نہ کہنا

بہت ہی بھوکے، بہت ہی مفلس، بڑے ہی آوارہ گرد ہیں ہم
بڑے ہی سرکش ہیں جانے کیا کہہ دیں غم کے ماروں سے کچھ نہ کہنا

کبھی نہ بھولیں گی ایسی گھڑیاں، یہ سخت تنہائیوں کے لمحے
گزارنی ہجر کی یہ راتیں مگر ستاروں سے کچھ نہ کہنا

فغاں کہ ایسی فضا میں جیناپڑا ہے جس کا یہ مشورہ ہے
ستم سہے جاؤ لیکن اپنے ستم شعاروں سے کچھ نہ کہنا

یہ کس طرح کی وفا چمن سے ہے کچھ کہو میرے ہم صفیرو!
خزاں سے بڑھ کر جو زہر آگیں ہوں اُن بہاروں سے کچھ نہ کہنا

یہ مسکراتے ہیں میرے غم پر تو میری ڈھارس بندھا رہے ہیں
خلوص اک طرح کا ہے ان کو بھی غمگساروں سے کچھ نہ کہنا

جو تیری ساقی گری پہ اُکتا کے میکدے سے نکل گئے ہیں
وہ اپنا حق چھین لیں گے اب ایسے میکساروں سے کچھ نہ کہنا

یہ دردِ غربت، یہ اشکِ پیہم، یہ اجنبی شہر کی ہوائیں
مگر جو وہ میرا حال پوچھیں تو میرے پیاروں سے کچھ نہ کہنا

(بمبئی۔مارچ1953)

○

لُٹ گیا گھر تو ہے اب صبح کہیں، شام کہیں
دیکھیے اب ہمیں ملتا بھی ہے آرام کہیں

کہیں ایسا نہ ہو فتنہ کوئی برپا ہوجائے
اب کبھی بھول کے لیجے نہ مرا نام کہیں

ہم ستم خوردہ ہیں کچھ دور ہی ہٹ کر رہیے
دیکھیے آپ پہ آجائے نہ الزام کہیں

جب پڑا غم تو بدلتی ہی نہیں یہ دنیا
جاکے اب بیٹھ رہی گردشِ ایام کہیں

میرے احباب کے اخلاص کا پردہ رہ جائے
مجھ کو پہلے ہی ڈبو دے دلِ ناکام کہیں

کوہ و صحرا کی طرف چل تو پڑے ہیں وحشی
پھر انھیں روک نہ لیں تیرے درو بام کہیں

میکدہ چھوڑ کے ہم رند بہت پچھتائے
ہم پہ سجتا ہی نہیں جامۂ احرام کہیں

○

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں
یاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو چاہ کے ارماں ہیں

فرصت ہو تو آکر دیکھو ہم آوارہ گردوں کو
کتنے غبار ہیں اس دامن میں، کتنے دل میں طوفاں ہیں

سب ہی ان کا ادب کرتے ہیں، چاہنے والا کوئی نہیں
ٹوکا اک گستاخ کو لیکن اب وہ خود ہی پشیماں ہیں

سر جو جھکا اس شوخ کے آگے اور کہیں پھر جھک نہ سکا
مسلک مہر و وفا میں واعظ ہم کافر بھی مسلماں ہیں

کچھ تو مداوا کرنا ہوگا اس آشفتہ مزاجی کا
اے غمِ جاناں! اپنے پرائے سب ہی تجھ سے نالاں ہیں

وادی وصحرا چھوڑ کے جب سے تیرے شہر میں آن بسے
جنگل جنگل ڈھونڈتے پھرتے ہم کو سارے غزالاں ہیں

○

اہلِ زمانہ کو بس میری اک رسوائی یاد رہی
ورنہ میری وفا کے جانے کتنے اور بھی عنواں ہیں

ہم نے اپنی اور سے خوباں کب تم کو بدنام کیا
تم نے جو جو داغ دیے ہیں وہ چھاتی پہ نمایاں ہیں

خیر سے اب کے اہلِ ستم کو دیوانوں سے کام پڑا
دیکھیں کتنی زنجیریں ہیں، دیکھیں کتنے زنداں ہیں

جو پامالِ خزاں ہیں اک دن خاک چمن سے اٹھیں گے
ان کا حشر نہ جانے کیا ہو جو مقتولِ بہاراں ہیں

ڈر نہ رہا کچھ موجِ بلا کا، رُخ بھی پھرا دنیا کی ہوا کا
رونا کیا ہے دکھ ساگر کا، اس کے ہم پر احساں ہیں

اک اک بوند جلی ہے لہو کی تب جا کر یہ رات کٹی
تیرے لیے اے صبح طرب ہم کب سے چاک گریباں ہیں

میرؔ کا طرز اپنایا سب نے لیکن یہ انداز کہاں
اعظمی صاحب! آپ کی غزلیں سن سن کر سب حیراں ہیں

○

پہلے بھی سہے ہیں رنج بہت پر ایسی گھڑی کب آئی ہے
کتنی کالی کالی راتیں، کتنی کڑی تنہائی ہے

میرے من کے ساگر میں ڈوبو تو شاید جان سکو
جو جو آنسو میں نے پیئے ہیں اُن میں کیا گہرائی ہے

مجھ کو میرے حال پہ چھوڑو، جو بیتی سو بیت گئی
دنیا بھر سے کون کہے یہ غم کی بڑی رسوائی ہے

کس کس طور زمانے بھر کے ہم نے کچوکے کھائے ہیں
تم بھی سن کر رونے لگے، یاں ہنس ہنس عمر بتائی ہے

ہم بے پروا عاشق تیرے، ہم غمِ دوراں کو کیا جانیں
جس کے کارن تجھ کو چھوڑا ہاں اُس غم کی دہائی ہے

جل جل کر ہم خاک ہوئے تب جا کے نگاہیں ٹھہری ہیں
ہائے وہ جسم ناز کہ جس میں آئینے کی صفائی ہے

جن گلیوں میں اعظمی صاحب! آپ بہت بدنام ہوئے
پھر بھی آپ وہیں جاتے ہیں اس میں کیا دانائی ہے

○

ترا غم چھپاتے آئے ہیں بلا کشانِ گیسو
انھیں اب نہ گدگدانا کہیں جاگ اٹھیں نہ آنسو

غمِ زندگی کے صدقے میں بہت ہوں لااُبالی
مجھے ڈر ہے ٹوٹ جائے نہ تری نظر کا جادو

میں جو مٹ گیا تو کیا غم کہ سنور گئی یہ دنیا
مرا عشق ہے سلامت تو ہزار دست و بازو

کوئی شور پھر اٹھے گا ہے یہ حکم باغباں کا
کہ درِ قفس تک آئے نہ کبھی گلوں کی خوشبو

میں تلاش صبحِ فردا میں کہاں کہاں نہ پہنچا
چھٹی بزمِ مے پرستاں، چھٹے مجھ سے کتنے گل رو

○

زہر پی کر بھی یہاں کس کو ملی غم سے نجات
ختم ہوتا ہے کہیں سلسلۂ رقصِ حیات

آخری شمع ہوں میں، میرا لہو جلنے دو
اب مرے بعد ملے گا نہ اندھیروں کو ثبات

صبح سے پہلے ہی برپا نہ کرو خیمۂ گل
کتنے گلچیں ابھی بیٹھے ہیں لگائے ہوئے گھات

ہم کہ میخانے کا میخانہ اٹھا کر پی جائیں
تجھ سے چھٹ کر نہ کٹی ہم سے مگر ایک بھی رات

ضبطِ غم کے تو کئی اور بھی موسم ہوں گے
رو لیں جی بھر کے کہ اب آئے نہ آئے برسات

تشنگی محفلِ خوباں میں تو کیا خاک بجھی
پھر بھی بیٹھا ہوں کہ شاید ہو یہیں آبِ حیات

اتنا باہر نہ قدم سرحدِ ادراک سے رکھ
تجھ کو ڈس لیں نہ کہیں تیرے جنوں کے لمحات

صبحِ کاذب سے تو کیا چاک ہو ظلمت کی ردا
جگمگا اٹھیں گے اب خاک کے لاکھوں ذرّات

○

تمام یادیں مہک رہی ہیں، ہر ایک غنچہ کھلا ہوا ہے
زمانہ بیتا مگر گماں ہے کہ آج ہی وہ جدا ہوا ہے

یہ سچ ہے کھائے ہیں میں نے دھوکے مگر نہ چاہت سے کوئی روکے
بجھے بجھے سے چراغِ دل میں بھی ایک شعلہ چھپا ہوا ہے

کچھ اور رسوا کرو ابھی مجھ کو تا کوئی پردہ رہ نہ جائے
مجھے محبت نہیں جنوں ہے، جنوں کا کب حق ادا ہوا ہے

میں اور خودسر میں اور سرکش ہوا ہوں تلقینِ مصلحت سے
مجھے نہ اس طرح کوئی چھیڑے یہ دل بہت ہی دکھا ہوا ہے

ہزار ناکام ہوں مگر آدمی سے مایوس بھی نہیں ہوں
ملے ہیں کتنے رفیق دل کو کبھی جو بے آسرا ہوا ہے

تشنگی ہو اک لمحۂ محبت، یہ پوچھ اس کی ہے کتنی قیمت
اب ایسے لمحوں کا تذکرہ کیا کبھی جو وہ بے وفا ہوا ہے

یہ درد ابھرا ہے عہدِ گل میں خدا کرے جلد رنگ لائے
نہ جانے کب سے سلگ رہا ہے، نہ جانے کب کا دبا ہوا ہے

وفا میں برباد ہو کے بھی آج زندہ رہنے کی سوچتے ہیں
نئے زمانے میں اہلِ دل کا بھی حوصلہ کچھ بڑھا ہوا ہے

ہر ایک لے میری اُکھڑی اُکھڑی سی دل کا ہر تار جیسے زخمی
یہ کون سی آگ جل رہی ہے، یہ میرے گیتوں کو کیا ہوا ہے

O

مجھے عزیز ہے یہ نکہتوں کا گہوارہ
خدا کرے نہ ملے تیرے غم سے چھٹکارا

کلی کلی تری دوشیزگی کی خوشبو ہے
چمن چمن تری رعنائیوں کا نظارا

قدم قدم ترے آبِ حیات کے چشمے
روش روش تری جوئے خرام کا دھارا

نفس نفس ترے کوچے میں ایک عالم ہے
یہاں سے لوٹ کے جانے کا اب کسے یارا

گلی گلی مری رسوائیوں کے چرچے ہیں
کہاں کہاں لیے پھرتی ہے بوئے آوارہ

پتّہ پتّہ، بوٹا بوٹا
(اشعار)

اشعار

دل میں یوں ہے ترا غم جیسے کوئی پردہ نشیں
کس سے جاکر میں ترے ہجر کا رونا روؤں

رہنے دو کچھ بھی نہیں اس کا سبب مت پوچھو
یونہی آنکھوں میں نمی سی کبھی آجاتی ہے

دل میں شعلے سے دبے ہیں یونہی رہنے دو انھیں
مجھ کو پنکھا نہ جھلو آگ بھڑک جائے گی

یہ بھی ہے ان کا کرم پاس مرے چھوڑ گئے
ہائے وہ درد کہ جس درد میں روتے نہ بنے

ذرا اِن ہجر کی گھڑیوں کا بھی کچھ حق ادا کرلوں
کہ تیرے ساتھ بھی میں نے تو کچھ راتیں گزاری ہیں

ہائے یہ حال کہ اس ترکِ تعلق پر بھی
کچھ نہیں کہتا کہ میری بھی تو رسوائی ہے

تم مجھے چاہو نہ چاہو لیکن اتنا تو کرو
جھوٹ ہی کہہ دو کہ جینے کا بہانہ مل سکے

یہیں پر دفن کردو اس گلی سے اب کہاں جاؤں
کہ میرے پاس جو کچھ تھا یہیں آکر لٹایا ہے

ہم نے تو خود کو بھی مٹا ڈالا
تم نے تو صرف بے وفائی کی

ہائے اس دستِ کرم ہی سے ملے جور و جفا
مجھ کو آغازِ محبت ہی میں مرجانا تھا

پھر نہ شاید مل سکیں ، پھر آزمالے ایک بار
تجھ سے چھٹ کر پھر کہاں جیتے ہیں دیوانے ترے

میں ضبطِ غم بھی سکھاؤں گا اس محبت کو
پھر ایک بار مجھے آزما کے دیکھ تو لے

تری وفا میں ملی آرزوئے موت مجھے
جو موت مل گئی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی

تم سے چھٹ کر ہمیں کیا کام ہے اب دنیا میں
تم نہیں ملتے تو مرنے کی حماقت ہی سہی

نہ اس کو تیری وفا مل سکی نہ دادِ ہوس
مجھے خود اپنی جوانی پہ رحم آتا ہے

جفائیں بھول کے پھر یاد کر رہا ہوں تجھے
ترا خلوص بھی اک مستقل حقیقت ہے

مری نظر میں وہی موہنی سی مورت ہے
یہ رات ہجر کی ہے پھر بھی خوب صورت ہے

نہ چاہو تم تو بہ ہرگام کتنی دیواریں
جو چاہو تم تو ملن کی ہزار صورت ہے

یہ اور بات ہے ترکِ وفا پہ مائل ہیں
تری وفا کی ہمیں آج بھی ضرورت ہے

تم مرے دل میں سمائے ہو، مری روح میں ہو
پھر بھی آجاؤ کہ تسکین نہیں ہوتی ہے

دیکھنے بیٹھا ہوں آئینے میں اپنی صورت
اور ترا چہرہ، ترا عکس نظر آتا ہے

ہائے وہ لوگ جن کے آنے کا
حشر تک انتظار ہوتا ہے

ملتا جاتا ہے ترے غم میں زمانے کا بھی غم
جلد آجا کہ کہیں راہ نہ گم ہوجائے

غمِ دوراں کو بھی دیکھا مگر اس کی تہ سے
آج انگڑائیاں لیتا ہوا اٹھا کوئی

رمزہ ہے ترے دم سے ورنہ ہم
گم کشتگانِ غمکدۂ روزگار تھے

غمِ حیات کی ظلمت میں ہائے وہ لمحے
چمک چمک سی اٹھی ہے کبھی جو تیری جبیں

چھپانے کو چھپایا وصل کی ہر شادمانی کو
اجازت دوتو اب ہم ہجر میں جی کھول کر رولیں

میں نے دیکھی ہے وہ اک ساعتِ نایاب بھی جب
جسم اور روح میں کچھ فرق نہیں رہتا ہے

پاک ہیں نظر میری ، عشق میرا سنجیدہ
پھر بھی کی ہے بوالہوسی حسن کے اشارے پر

وہ چند لمحے جو کہ ترے ساتھ گزرے ہیں
شاید وہ لمحے عمرِ ابد تک جواں رہیں

پھر چلے جانا ابھی وقت بہت باقی ہے
ابھی رک جاؤ کہ جی بھر کے کہاں دیکھا ہے

ترے جمال کی تصویر پھر بھی کھنچ نہ سکی
بھری بہار کی تشبیہ یوں تو اچھی ہے

تھے اگرچہ سب امیدوں کے چراغ روٹھے روٹھے
تری یاد کے اُجالے میں گزار دی ہیں راتیں

چاندنی کھِل گئی، پھر ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
ذرا ٹھہرو مجھے آواز کوئی دیتا ہے

آیا نہیں ہے تو ابھی نکلا نہیں ہے میرا چاند
جتنے تھے پھول کھِل گئے سب ترے انتظار میں

آخرِ شب ہے مگر پھر بھی وہ آسکتے ہیں
شمع کی لَو کو ذرا اور ابھی اُکسا دو

ہجراں میں تیرے وحشی دل کی گلابیوں کو
پیتے رہے تو جاکر چہرے پہ رنگ آیا

رو دھو کر چپ رہنے پر بھی
دل چھلکے ہے پیمانہ سا

کسی سے ملنے کی آرزو میں کسی طرح شامِ غم تو کاٹی
جواں راتوں کے سوگوارو نہ نیند آئی تو کیا کروگے

وادی وادی میں مہکتی ہے تری زلفِ رسا
کتنی راہوں پہ ابھی مجھ کو سفر کرنا ہے

ہمارے بعد اس مرگِ جواں کو کون سمجھے گا
ارادہ ہے کہ اپنا مرثیہ بھی آپ ہی لکھ لیں

یہ اجل ہے کہ ہے حیاتِ نو
کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے

اُجڑ کے بن تو سکا میرا آشیاں لیکن
انھیں کو برق گرانے کا حوصلہ نہ ہوا

بہت مدت سے یاد آئی نہ تھی اجڑے ہوئے گھر کی
نہ جانے کیوں بھر آیا دل تری مہماں نوازی پر

اتنے دن بیتے کہ بھولے سے کبھی یاد تری
آئے تو آنکھ میں آنسو بھی نہیں آتے ہیں

ہیں مرے پاس بھی تصویریں تری، تیرے خطوط
تو اجازت دے تو کہہ دوں کہ یہ سب فرضی ہیں

اب اُن بیتے دنوں کو سوچ کر کچھ ایسا لگتا ہے
کہ خود اپنی محبت جیسے اک جھوٹی کہانی ہے

رُباعیات

ہر درد کو پہلو میں دبا رکھا ہے
ہر زخم کو سینے میں چھپا رکھا ہے
پھر بھی یہ کہا کرتے ہیں مجھ سے احباب
یہ آپ نے کیا حال بنا رکھا ہے

سمجھاؤ مجھے آکے ملامت ہی کرو
اُس شوخ کی کچھ آکے شکایت ہی کرو
تنہائی سے بڑھ کرنہیں دنیا میں عذاب
اے ناصحو اب آکے نصیحت ہی کرو

وحشت پہ مری کیوں ہیں پریشاں یہ لوگ
برباد ہوں میں تو کیوں ہیں نالاں یہ لوگ
زخموں کو کریدتے ہیں بن کر ہمدرد
اے کاش نہ کرتے مجھ پہ احساں یہ لوگ

ہم تم پہ نئے نئے جو عاشق ہوتے
سو درد جدائی پہ بھی ہم خوش ہوتے
اب جی نہیں لگتا ہے پرانے غم میں
آجاؤ کہ تھک گئے ہیں روتے روتے

وہ مل نہ سکے تو ہوسِ جام کریں
اب سائے میں میکدے کے آرام کریں
وہ تھے تو ہمیں خوف تھا رسوائی کا
لوگوں سے کہو اب ہمیں بدنام کریں

بھجن

(کنور اخلاق کی نذر)

(1)

پریم کی بنسی کس نے بجائی، من کس کا متوالا ہے
شیام ملن کی بیلا آئی، پھر گھر میں اُجیالا ہے
گھور نراشا سے اُکتا کر موت کی بھکشا مانگنے والے
پھر کس نے یہ باہیں پکڑیں، کس نے تجھے سنبھالا ہے
پریتم درس دکھانے آئے، جیون بھر کی پیاس بجھالے
اُن کے پیارے پیارے نینوں میں امرت کا پیالا ہے
پاگل من کو چین نہ آئے، اُن بن جگ میں کچھ نہ بھائے
اس اگنی کو کون بجھائے، یہ ہردے کی جوالا ہے
جمنا تٹ ہے، تاج محل ہے، ان کے نام کی سُمرن ہے
تم نے کنور جی یہ پوجا کا رستا نیا نکالا ہے

(2)

اپنے دوار پہ رہنے دو
میں ہوں پریم بھکاری پریتم! اپنے دوار پہ رہنے دو

من میں تمھارا نام بسا ہے اور لوں کس کا نام
جب سے تمھارا جوگ لیا ہے اب نہیں کوئی کام
جنم جنم کا روگ اٹھایا، پریت کا روگ بھی سہنے دو

آؤ تمھاری موہنی مورت کو ہردے میں بٹھالوں
آؤ تمھارے کومل چرنوں کو آنکھوں سے لگالوں
اپنے پریم کی نرمل دھارا میں مجھ کو بھی بہنے دو

سب نے مجھ کو ٹھکرایا ہے تم نہ مجھے ٹھکرانا موہن!
میں ہوں تمھارا پاگل پریمی میرا کون ٹھکانا موہن!
مجھ کو اپنا بنالو پریتم، مجھ کو اپنا کہنے دو

(3)

پگ پگ پر ہے کھڑا اندھیرا رستا کون دکھائے
بھگون! رستا کون دکھائے

روم روم میں درد بسا ہے ، نس نس میں ہیں گھاؤ
ہردے کی پیڑا ہے انوکھی، اس کا کون اُپاؤ
اس کا کوئی حال نہ جانے، کوئی نہ سمجھے بھاؤ
من کا نگر سنسان نگر ہے اس کو کون بسائے
پریتم! اس کو کون بسائے

تم سے ملتے دل ڈرتا ہے، کیسے اسے سمجھاؤں
بن دیکھے بھی رہا نہ جائے، اک پل چین نہ پاؤں
ہاتھ پکڑ لو تم آ کر تو جمنا تٹ پر آؤں
تم بن مجھ کو کون پکارے، مرلی کون سنائے
کھیا مرلی کون سنائے

اختتامیہ

جدید تر نسل کے ایک نوخیز شاعر کے نغمات کا یہ مجموعہ جو "کاغذی پیرہن" میں جلوہ گر ہو کر منظرِ عام پر آیا ہے دراصل ایک نوائے سینہ تاب ہے جو جذبات کی اتھاہ گہرائیوں سے بلند ہوئی ہے۔ اس میں شاعر کی شخصیت کا رنگ بدرجۂ کمال مرتسم ہے۔ اس میں خروش اور خطابت نہیں ہے۔ خلوص دردمندی اور موسیقیت ہے جو اپنے آپ سے الجھنے اور اپنے آپ کو زندگی کے آتش خانے میں تپانے سے پیدا ہوئی ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی کو ادب کی دنیا نے اول اول آتش اور ظفر کے نقاد اور مفسر کی حیثیت سے جانا۔ انھوں نے اردو کے کلاسیکل شاعروں کا مطالعہ جس تفصیل اور ذوق و شوق سے کیا ہے ان کے ہم عصر اور ہم عمر شعرا میں معدودے چند نے کیا ہوگا۔ ماضی کی اس جاندار اور مسلسل روایات سے خود ان کے تغزل کا جو رشتہ ہے اس کی شرح آگے آئے گی۔ یہاں صرف یہ بات نظر میں رکھنے کی ہے کہ ایک طرف تو متقدمین اور متاخرین کے کلام سے گہری واقفیت اور وابستگی کے باعث اعظمی صاحب کے یہاں ایک خاص طرح کا جچا تلا انداز اور ایک نوع کی سہولت اظہار پیدا ہو گئی اور دوسری جانب میر اور ظفر وغیرہ کی طرف ان کی طبیعت کے لگاؤ سے ان کے مزاج کے عناصرِ ترکیبی پر روشنی پڑتی ہے۔

اعظمی صاحب کی شاعری کی عمر اتنی مختصر نہیں جتنی اس منتخب مجموعۂ کلام سے ظاہر ہوتی ہے تاہم انھوں نے بہت جلد ارتقا کی کئی منزلیں طے کی ہیں۔ شروع شروع میں غزلوں کی نسبت ان کی نظموں نے پڑھنے والوں سے داد تحسین حاصل کیں ہیں۔ میں خود ان کی نظموں سے پہلے

متعارف اور متاثر ہوا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے سرگرم اور پرجوش سکریٹری تھے اور ترقی پسند نقطۂ نظر سے تخلیق اور تنقید کا ایک مخصوص معیار سامنے آ رہا تھا۔ یوں تو یہ تحریک 1936-1935 ہی میں سجاد ظہیر اور ان کے رفقا کی مساعی کی بدولت عالمِ وجود میں آ چکی تھی مگر ابتدا میں ردِعمل کی شدت کی وجہ سے اس میں اعتدال اور توازن کی کمی تھی بالکل اُسی طرح جیسے پانی کے تیز بہاؤ کی وجہ سے سطح پر کچھ گدلاپن آ جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس میں قوتِ امتیاز ابھرتی گئی اور تیقن پیدا ہونے لگا۔ اعظمی صاحب کی نظمیں صرف سات سال کی قلیل مدت پر پھیلی ہوئی ہیں۔ جب انھوں نے یہ نظمیں کہنی شروع کیں شاعری میں موضوع اور فن کے رشتوں پر بحث کا بازار گرم تھا اور آزاد نظم کو بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے محض خارجی دباؤ یا مقصد کے پیشِ نظر اپنے لیے نظم کا میدان پسند نہیں کیا کیوں کہ جیسا آگے چل کر واضح ہوگا ان کے یہاں نظم اور غزل اکثر و بیشتر متوازی انداز میں چلتی رہتی ہیں۔ بہرحال میں جس بات پر زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ پابند اور آزاد نظم کے یہ تجربے کچھ تو اس لیے کیے گئے کہ فضا میں ایک خوشگوار اور صحت مند تبدیلی کا احساس عام تھا اور کچھ اس لیے کہ شاعر جن متنوع تجربات اور احساسات و کیفیات کے جس تلاطم کو ضبطِ اظہار میں لانا چاہتا تھا غزل کی تنگ دامانی اس کے لیے ناکافی تھی۔ غزل کے اپنے محاسن اور امتیازات ہیں لیکن غزل شاعری کے تمام امکانات پر محیط نہیں۔ نظم کے جو اچھے یا برے تجربے اب تک ہماری شاعری میں کیے گئے ہیں وہ سب کے سب محض ضد، بت شکنی یا جدت کے زعم کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ شعری تخلیق کی خفتہ صلاحیتوں کو قدرے وسعت کے ساتھ بروئے کار لانے کی تمنا کے آئینہ دار ہیں۔ روایت اور تجربہ دونوں اپنی اپنی جگہ اہم اور ضروری ہیں۔

اعظمی صاحب داخلی احساسات کے شاعر ہیں۔ ان احساسات کی ترجمانی میں صداقت اور سوز و گداز ان کی شاعری کی اعلیٰ ترین قدریں ہیں اور اسی لیے ان میں تاثیر کا جادو اس درجہ موجود ہے۔ زندگی کے مصائب اور حوصلہ شکن ناکامیوں کو انھوں نے اپنے ذہن اور دل کی تہوں میں رچایا بسایا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کو الٹ پلٹ کر دیکھا ہے۔ ان کے اندازِ بیان میں ایک طرح کا اچھوتا پن ہے۔ ان پر جو کچھ بیتی ہے اسے انھوں نے بلاکم و کاست بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں روایت یا صناعی کی اہمیت کم ہے، براہِ راست تجربے کی زیادہ۔ ان کے یہاں جذبات کی بیکرانی اور ان کا وفور نہیں، دھیرے دھیرے سلگنے والی غموں کی آنچ ہے۔ ان کی زندگی ایک مستقل جد و جہد اور کشمکش کی داستان ہے جس میں غمِ جاناں اور غمِ روزگار سموئے ہوئے

ہیں۔ یہ کوئی انہونی یا انوکھی بات نہیں ہے لیکن غموں یا ناکامیوں کو انگیز کرنے، ان کے زہر کو امرت بنانے اور اس میں اپنے آپ کو ڈبو کر ان سے ابھرنے کا کام جس سے شاعری کی سوتیں پھوٹ پڑیں شخصیت اور فن دونوں کے ریاض اور پختہ کاری کی دلیل ہیں۔ میر اور فانی دونوں کے یہاں مرکزی حقیقت غم کا احساس اور ادراک ہے۔ فانی کے یہاں ذہن بھی ہے جس کی وجہ سے وہ غالب کے قریب پہنچتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں مگر پھر بھی فانی کے یہاں درد و کرب ہے اور میر کے یہاں سوز و گداز۔ فانی کے یہاں انقباض اور پست ہمتی ہے۔ میر کے یہاں تزکیۂ نفس، کشادگی اور رفعت و شادابی۔ عام انسان اور شاعر کے تجربے میں جو فرق ہوتا ہے وہ صرف شدت اور اس کے ابلاغ پر قدرت کا فرق نہیں، اس کے کیف و کم، اس کے مدارج اور اس کے نازک امتیازات کا فرق ہے۔ قطرہ میں دجلہ دیکھنا، متضاد جذبات کی لہروں کو محسوس کرنا اور ان سب کے باوجود انھیں ایک رشتہ میں پرو کر کسی ایسی ہم آہنگی کا احساس کرنا جو حقیقت کے باطن میں موجود ہے۔ ان سب کے لیے جس دیدہ وری کی ضرورت ہے وہ ایک شاعر ہی کا منصب ہے۔

اعظمی صاحب کی نظمیں ان کی انفرادی روح کی داستان ہیں۔ یہ ایک خود نوشت سوانح حیات ہیں۔ ایک آئینہ ہیں جس میں ان کی شخصیت کے خدوخال آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں۔ یہ بات ممکن ہے بعض لوگوں کو بدگمان کرے اور ان نظموں کے تاثر یا وزن و وقار کے متعلق ان کے دل میں شبہ پیدا کرے لیکن شاعری اور ادب میں انفرادی نفس سے گریز ممکن ہی کہاں ہے۔ ہاں یہ انفرادی نفس تنگ، مختصر اور چھوٹا ہوگا تو شاعری کی بساط بھی سمٹ کر رہ جائے گی۔ ابلاغ کا داخلی پہلو اتنا اہم نہیں جتنا اس کا خارجی پہلو۔ شاعر کا کام صرف اظہار بیان کے ذریعہ اپنے احساسات کے دباؤ سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں پڑھنے والوں کو اپنے معنی خیز تجربات اور نادر احساسات میں شریک کر کے ان کی غیر شعوری داخلی تربیت کرنا ہے۔

اعظمی صاحب کی نظموں میں جا بجا ایسے اشارے ملتے ہیں جن سے ان کی واردات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور تصویر کا ایک خاکہ مرتب کیا جا سکتا ہے۔ ان نظموں پر شروع سے آخر تک ایک حسرت و یاس ایک ناکامی اور تشنگی اور ایک اضطراب و انتشار چھایا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں گو ''میرا گھر میرا ویرانہ''، ''اپنی یاد'' اور کئی اور نظمیں قابلِ ذکر ہیں مگر ''آپ بیتی'' میں انھوں نے نہایت فنکارانہ انداز میں اپنے داخلی اور خارجی ماحول کی عکاسی کی ہے۔

کیا کہوں مجھ کو کہاں لائی مری عمر رواں
آنکھ کھولی تو ہر اک سمت اندھیرے کا سماں

رینگتی اونگھتی مغموم سی اک راہ گزر
گرد آلام میں کھویا ہوا منزل کا نشاں
گیسوئے شام سے لپٹی ہوئی غم کی زنجیر
سینۂ شب سے نکلتی ہوئی فریاد و فغاں
ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہواؤں میں وہ غربت کی تھکن
در و دیوار پہ تاریک سے سائے لرزاں

ان اشاروں کو پُر کرنے کے لیے شاعر کی زندگی کی اندرونی شہادت ضروری ہے اور جاننے والے جانتے ہیں کہ اعظمی صاحب نے اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں کتنی صبر آزما مشکلات اور شکیب طلب آزمائشوں سے اپنے آپ کو گزارا ہے۔ وہ مولویوں کے ایک مشہور خاندان کے چشم و چراغ ہیں مگر ان کی افتادِ طبع نے انھیں گھٹے ہوئے مذہبی ماحول کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں صرف اپنی ہمت اور محنت پر بھروسہ کیا اور اپنی تعلیم کے مصارف خود برداشت کیے۔ وہ سیاسی تحریکوں میں شریک رہے اور اس کی بدولت انھیں پولیس کی سختیاں اور جیل کی صعوبتیں بھی جھیلنا پڑیں۔ باقاعدہ عملی زندگی کا آغاز کرنے کے بعد بھی انھیں پے بہ پے ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑا اور اسی دوران وہ عنفوانِ شباب کی حرماں نصیبیوں سے بھی دو چار رہے۔ ابتدائیہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ محض انشاپردازی نہیں، تلخ حقائق کے چہرے سے نقاب اٹھانے کی ایک رمزیاتی کوشش ہے۔

''آپ بیتی'' کے اس تراشے میں داخلی اور خارجی زندگی کے تانے بانے ملے ہوئے ہیں اس کا ثبوت اور بھی کئی نظموں میں ملتا ہے جن میں ''تذکرہ دہلی مرحوم'' اور ''شام اودھ'' قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مسئلہ خاصا بحث طلب ہے کہ سیاسی نظموں کی ادبی قدر و قیمت کیوں کر متعین کی جائے یا سماجی اور سیاسی شعور کی عکاسی کے لیے کون سا پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے۔ ادب اور خاص طور پر شاعری میں کسی سیاسی مسئلے کا واضح اور کھلا ہوا حل تلاش کرنا غلطی ہے۔ ادبی اظہارِ بیان اور سیاسی اظہارِ بیان میں سخت گیر مطابقت قائم کرنا یا اس کی امید اور مطالبہ کرنا ادب کے بنیادی طریقۂ کار سے غفلت اور ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے۔ پھر براہِ راست اور اشاراتی شاعری میں بھی امتیاز کرنا ضروری ہے اور یہ بھی پتہ لگانا ضروری ہے کہ شاعر کے معتقدات اور اس کے شاعرانہ شعور میں کس درجہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اگر یہ ہم آہنگی مکمل اور ناقابلِ تقسیم ہے اور اس کے معتقدات اس کے خونِ جگر میں رچ بس گئے ہیں تو شاعری میں بھی ان کی توانائی، ان کی صداقت اور ان کی قوت

تاثیر پیدا ہو جائے گی۔ یہ بے شک درست ہے کہ جس شاعر نے روحِ عصر کو اپنے اندر جذب نہیں کیا۔ اس کے نغمات کی مثال ان پودوں جیسی ہے جنھیں حرارت خانہ میں رکھ کر پرورش کیا گیا ہو اور جو کھلی ہوئی فضا کے صحت مند اثرات سے محروم ہوں۔ لیکن اس روح عصر کو کس طرح پیش کیا جائے اس میں ابدیت کے عناصر کیسے داخل کیے جائیں اس مسئلہ پر بسا اوقات خاطر خواہ غور نہیں کیا جاتا۔ اعظمی صاحب کی ان دو نظموں کے علاوہ اور بھی کئی جگہ ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے خوابوں کے طلسم میں اسیر ہونے کے باوجود ان بنیادی تبدیلیوں اور ہمعصری زندگی پر ان کے اثرات کا شعور رکھتے ہیں جو بدلتی ہوئی سماجی اور اخلاقی اقدار نے پیدا کر دی ہیں۔ آج کی زندگی میں جو تلخی، بے یقینی اور لامرکزیت نمایاں ہے اور جس نے تمام سہاروں کو ہٹا کر اور تمام اوہام کو شکست دے کر ہمیں برہنہ حقائق سے دوچار کر دیا ہے اس کا کم و بیش ادراک آج کل کے تمام ادیبوں اور شاعروں کے یہاں جھلکتا ہے۔ یہ ادراک اعظمی صاحب کی شاعری کا جزو غالب نہیں ہے لیکن انھوں نے اس سے فرار کی راہیں بھی نہیں ڈھونڈی ہیں بلکہ کئی جگہ اپنے تخلیقی جذبہ اور وجدان کے واسطہ سے وہ اس منزل سے گزر کر نئی زندگی کے امکانات اور نئے عرصۂ وجود کی تلاش میں کافی دور نکل گئے ہیں۔

اعظمی صاحب کی بیشتر نظمیں محبت کی نظمیں ہیں جن کا مرکز و محور ان کی اپنی ذات ہے۔ ان میں ماورائیت نہیں بلکہ یہ اسی جہانِ رنگ و بو کے سوز و ساز اور درد و داغ کی آئینہ دار ہیں۔ اپنی نظم ''کہانیاں'' میں شاعر نے اپنی محبت کے مدوجزر کا نقشہ کھینچا ہے اور خوبصورت تشبیہوں اور استعاروں کی مدد سے ایک ایسی فضا تیار کی ہے جس میں اس کی آرزوؤں اور اس کے ارمانوں کی حسین نقش گری موجود ہے۔ اس نظم کے مختلف مرقعوں میں جذبات کے زیر و بم کا ایک تصویر خانہ نظر آتا ہے۔

اسی طرح ''لمحۂ جاوداں''، ''آخری رات'' اور ''کنجِ محبت'' کو بھی محبت کے ان ارضی ترانوں میں ایک امتیاز حاصل ہے خصوصاً ''آخری رات'' میں نقش مکمل اور دوار بھرپور ہے۔ یہ نظم چھوٹی بحر میں ہے۔ اس میں بظاہر آراستگی بیان بھی نہیں تاہم اس میں ایک بے چین ذہن اور ایک بھٹکی ہوئی روح کا عکس ملتا ہے۔ نظم کی سادگی بلکہ درشتی (Austerity) اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ داخلی محسوسات پختگی حاصل کر چکنے کے بعد خود بخود شعر کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں۔ اس نظم کو پڑھ کر بے اختیار فیض کی مشہور نظم ''تنہائی'' کا خیال آتا ہے:

لیکن آج بھی ہمدم　　یہ اداس دروازے

شاہراہ کی جانب جیسے تکتے رہتے ہیں
دیکھ ان دریچوں پر کوئی بوند پھر ٹپکی
نیند کے درختوں کو کوئی پھر ہلاتا ہے
اور جیسے رہ رہ کر میرے کان بجتے ہیں
موت کے قدم کی چاپ آ کے لوٹ جاتی ہے
میری ناتمام الفت آسرا دلاتی ہے
آج جاگ کر کاٹو ساعتِ فسردہ کو
آج کوئی آئے گا
آج کوئی آئے گا

اعظمی صاحب کے یہاں ایسی نظمیں اور بھی کئی ہیں جن میں جذبہ پوری طرح سمویا ہوا ہے۔ عام طور سے یہ نظمیں چھوٹی بحر میں ہیں۔ ان میں الفاظ پرشوکت نہیں بلکہ مانوس اور ٹھیٹھ ہیں اور پڑھنے والے پر ایک گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ان نظموں پر ہندی شاعری کے مطالعے کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ہندی شاعری میں جو رس، گھلاوٹ اور بے ساختگی ہے وہ کڑھے ہوئے جذبات سے پیدا ہوئی ہے اور لہجے کی نرمی، اپنائیت اور سادگی سے ان نظموں میں ''برہ کی ریکھا''، ''جن راتوں میں نیند نہ آئے''، ''گیتانجلی'' اور ''دوری'' خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اعظمی صاحب فرقت کے شاعر ہیں وصل کے نہیں اور ہندی شاعری میں بھی تاثر کی فراوانی وہیں ہے جہاں درد مجبوری سے دلنشیں راگنیاں پیدا کی گئی ہیں۔ یہ عام تجربہ ہے کہ بسا اوقات غم اور حرماں نصیبی انسان کے جذبات واحساسات میں لامحدود وسعت پیدا کر دیتے ہیں۔ غم کائنات کی سب سے بڑی حقیقت تو نہیں البتہ ایک ایسی حقیقت ضرور ہے جو وجودِ انسانی میں بصیرت کا وسیلہ بن جاتا ہے۔ غم میں جو ابدیت ہے وہ عارضی اور سطحی مسرت میں کہاں۔ یہی وجہ ہے کہ المیہ طربیہ سے زیادہ تزکیۂ نفس کا ذریعہ بنتا ہے اور وہ انبساط مہیا کرتا ہے جسے سنسکرت ڈرامہ کی اصطلاح میں رس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اعظمی صاحب نے اپنے دل کی ساری خلش، اپنی روح کی تمام بے چینی اور اپنے تحت الشعور کی سب کاہش اور الجھن کو ان چھوٹی چھوٹی پراثر اور کومل نظموں میں نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔

اعظمی صاحب کی بعض نظموں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کا ڈرامائی طرزِ بیان ہے۔ ''جاگتے سائے''، ''اپنی یاد''، ''کاغذی پیرہن'' اور ''آدمیوں کے میلے میں'' یہ سب نظمیں اپنے اندر خود کلامی کا عنصر رکھتی ہیں۔ اس مجموعے کی بیشتر نظمیں انفرادی احساساتِ مسرت وغم کے گرد

گھومتی ہیں اور ان میں بھی احساساتِ غم اپنی کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے زیادہ پراثر ہیں۔ خودکلامی کا انداز اختیار کرنے سے معنی و مفہوم کی نئی سطحیں نکل آتی ہیں۔ایسا کرنے سے شاعر اپنی روح کو ٹٹول ٹٹول کر دیکھنے میں کامیاب ہوتا ہے۔اپنے نفس کا تجزیہ کرنا چاہتا ہے اور متضاد جذبات کے گردابوں میں اسیر ہونے کے باوجود ان کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے۔ان نظموں میں وہ اپنے اندرون میں شناوری کا مشتاق معلوم ہوتا ہے اور وہاں سے جو موتی نکالتا ہے وہ انھیں بغیر تراش خراش کے پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیتا ہے۔وہ حقیقت کو برہنہ دیکھنے کے لیے کبھی حال کا جائزہ لیتا ہے، کبھی ماضی کے سیمیائی طلسم میں کھو جاتا ہے، کبھی حال اور ماضی کو بالمقابل رکھ کر ان کے اصلی راز کو گرفت میں لانا چاہتا ہے اور کبھی فضا کی تیرگی اور کدورت کے باوجود ایک امید افزا مستقبل کو اپنے آئینۂ ادراک میں منعکس دیکھتا ہے۔اس وقت ایک لمحہ ابدیت (Eternity) میں تبدیل ہو جاتا ہے اور یہ واردات صرف دل کی واردات نہیں رہ جاتی، زندگی وزمانہ میں بصیرت کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ یہ نغمے صرف ناکام محبت کے نغمے نہیں رہ جاتے، غم کی ماہیت نفسی کی تفہیم کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔اپنی نظموں میں شاعر نے کئی جگہ دو کردار بھی پیش کیے ہیں اور اپنے علاوہ ایک دوسرے کردار کی تخلیق سے ذاتی احساسات و کیفیات کی ترجمانی کو ایک معروضی رنگ دینے کی کوشش بھی کی ہے۔اس فنی بدعت کا جواز یہ ہے کہ اس طرح شاعر جذبات کی تنگنائے میں ایک وسعت پیدا کرنا چاہتا ہے اور دو مختلف رنگ، دو مختلف آوازوں اور دو مختلف نقطہ ہائے نظر کو نظموں کی کائنات میں سمو کر ان میں ایک طرح کا تنوع پیدا کرنا چاہتا ہے جس سے وہ محض انفرادی ردِعمل کی گونج نہ معلوم ہوں بلکہ ان کے دائرۂ اثر کی توسیع کی جا سکے اور خود شاعر کے سامنے اپنے ردِعمل کے مختلف پہلو بیک وقت اجاگر ہو سکیں۔

چونکہ یہ نظمیں اپنی وضع کی ایک حد تک نئے تجربے ہیں اس لیے کئی فنی خوبیوں کے ساتھ ہی ان میں چند خامیاں بھی راہ پا گئی ہیں۔اول تو یہ کہ ان میں سے بعض نظمیں ذاتی تجزیہ کے نتائج کو مادی اور محسوس (Concrete) اور غیر منفصل (Immediate) انداز میں پیش کرنے کے بجائے صرف چند معمولات اور حادثات کی فہرست بن کر رہ گئی ہیں اور دوسرے یہ کہ ان میں بعض جگہ خود رحمی (Selfpity) کا عنصر غالب آ گیا ہے اور ظاہر ہے کہ خود رحمی کی نمائش فنی اعتبار سے مستحسن نہیں۔ایسے مقامات پر یہ احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے غموں اور دکھوں کے سامنے سپر ڈال دی ہے اور ان پر فتح پانے اور ان سے شعر کا جادو جگانے میں وہ ناکام رہا ہے۔اچھی اور کامیاب شاعری میں جذبہ محض اپنی ابتدائی یا عنصری حالت میں ادا نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی ناپختگی کو دور

کرنے اور اس کا عرفان حاصل کر کے اسے ایک ٹھہرے اور سنبھلے ہوئے انداز میں پیش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ مہذب اور صیقل شدہ جذبہ داد و فریاد اور چیخ و پکار سے بلند ہوتا ہے۔ اس میں ایک توازن، ایک تناسب اور ایک نفوذ کرنے والی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اعظمی صاحب کی دو ایک نظموں میں اس گہرے ضبط کی کمی کی وجہ سے جذبات کی فراوانی اور شدتِ جذباتیت میں تبدیل ہوگئی ہے۔

باوجود اس کے اعظمی صاحب کی اکثر نظمیں ایک گہرے غم اور ایک محیط اندوہ و ناکامی کی آئینہ دار ہیں۔ بعض جگہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھی فضا اور ماحول کی اداسی اور تیرگی کے پیچھے امید کی کرنوں کو پا لیتے ہیں۔ بعض دفعہ خارجی دنیا کی تبدیلیاں انھیں متاثر کرتی ہیں اور وہ اپنی خود رفتہ حالت میں ایک خاموش مگر خوشگوار تغیر محسوس کرتے ہیں۔ بعض دفعہ نیرنگ فطرت کا معصوم حسن انھیں آواز دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض دفعہ وہ ایک لمحے کے لیے یہ خیال کرتے ہیں کہ رنج و غم کے ان گہرے سایوں کے پیچھے ایک سدا بہار دھرتی ہے جو اپنی دلربائی اور دلنوازی سے انھیں اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور بعض دفعہ اپنی ''متاعِ گراں'' کی موجودگی انھیں یہ محسوس کراتی ہے کہ وہ زندگی کے بھاری بوجھ کو بہرحال کسی نہ کسی طرح برداشت کر کے ایک جہانِ نو کے منتظر رہ سکتے ہیں۔ ''نیا جنم'' میں ایک خارجی اور وسیع تر فضا سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کا عزم یوں ظاہر ہوتا ہے۔

جدھر بھی آنکھ اٹھاتا ہوں شفق کی مسکراہٹ ہے
وہی سورج ہے لیکن اور ہی کچھ جگمگاہٹ ہے
نہ جانے کیسے کیسے پھول اب مجھ کو بلاتے ہیں
نہ جانے کیسے کیسے رنگ سے دل کو لبھاتے ہیں
فضا میں دور تک پھیلے ہوئے وہ کھیت سرسوں کے
یہ کہتے ہیں کہ اب ارماں نکالو اپنے برسوں کے
کوئی آواز دیتا ہے کہ آؤ تم ہمارے ہو
مری دھرتی کے بیٹے، میری دنیا کے دُلارے ہو
تمھاری آنکھ میں جو خواب سوئے ہیں وہ میرے ہیں
تمھارے اشک نے جو بیج بوئے ہیں وہ میرے ہیں

اور اسی طرح ''خوابوں کی سرزمین'' کے آخری حصہ میں اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوجود

شاعر زندگی اور انسان پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں جو مصائب برداشت کیے ہیں اور جن مایوسیوں اور تلخیوں کا مزہ چکھا ہے، جس زہر غم کو اپنے رگ و پے میں اتارا ہے اور جن سپنوں کے رنگ محلوں کی شکست اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے ان سب کے باوصف وہ اپنی اس دنیا کے ذرّے ذرّے سے محبت کرتا ہے۔ کیونکہ اسے اس کی باطنی اچھائی میں یقین ہے اور اسے امید ہے کہ شاید اس شک اور تذبذب، اس نفرت اور ظلم، اس حق تلفی اور دل آزاری سے کبھی محبت و مرحمت اور فروغ و آسائش کے چشمے پھوٹ نکلیں۔

اس مجموعے میں دو نظمیں ''سورج مکھی کا پھول'' اور ''متھلا دیس'' نوجوان شاعر کی فنی قدرت اس کے مشاہدہ کی گہرائی اور اس کی شفاف بصیرت کی دلیل ہیں۔ اول الذکر نظم میں شاعر نے اچھوتی تشبیہوں اور نازک محاکات کی مدد سے اپنے باطن کے سارے سوز و گداز، ساری بے چینی اور تڑپ اور ساری محرومی اور دردمندی کو زبان عطا کردی ہے اور اپنے ذاتی احساسات کو ایک معروضی تناسب باطنی (Perspective) کے بالمقابل پیش کرکے دکھایا ہے۔ یہ نظم شاعر کے (Selfprojection) کی بہت ہی کامیاب اور مؤثر کوشش ہے۔ دوسری نظم میں مؤقلم کی چند جنبشوں سے ایک حسین و جمیل تصویر بنائی ہے جس کی دیدہ زیبی اس کی تفصیل میں نہیں صرف خطوں کی کشش میں ہے۔ چند اشعار کی محدود وسعت میں ایک پوری فضا، ایک پورے ماحول، ایک پوری سرزمین کو جو شعر و نغمہ میں ڈوبی ہوئی ہے، اس طرح اسیر کیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کے تاثرات میں فوراً ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر کا انفرادی نفس اتنا دخیل نہیں جتنا کہ پہلی نظم میں بلکہ خارجی اور داخلی عناصر کو بڑی چابکدستی کے ساتھ آمیز کیا گیا ہے۔ یہ نظم بیانیہ نہیں بلکہ اشارتی ہے۔ اس میں کچھ ایسی پیچیدگی بھی نہیں۔ پھر بھی یہ عام اور مروجہ انداز سے ہٹ کر کہی گئی ہے اور اس میں تاثرات کے انتخاب اور ترتیب کا بڑا خیال رکھا گیا ہے۔ ان دونوں نظموں کی زبان، ان کے آہنگ اور ترنم پر ہندی شاعری کا پرتو محسوس ہوتا ہے۔

اعظمی صاحب کی نظموں اور غزلوں میں ایک ذہنی تسلسل ملتا ہے۔ ان کا مزاج اور خمیر بھی ایک ہی ہے۔ ایسا ہونا لازمی بھی تھا کیونکہ اگر فن کار کی شخصیت میں اندرونی ارتباط موجود ہے تو پھر فارم کا فرق کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ ویسے ایک سے زیادہ فارم میں اپنے مرکزی خیالات و احساسات کا اظہار کسی شاعر کے حق میں ایک نیک فال ہے اور اس سے ذہنی لچک کا ثبوت ملتا ہے۔ بعض اوقات مختلف سانچوں میں طبع آزمائی کرنا اس پر بھی دلالت کرتا ہے کہ شاعر کا وجدان کسی ایک فارم میں احساس تکمیل کے ساتھ ضبط اظہار میں نہ آنے کی وجہ سے کچھ ناآسودہ سا رہتا

ہے اور اس لیے مختلف سانچوں کو برتنا چاہتا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ کا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں نظمیں اور غزلیں ایک حد تک یکساں حجم رکھتی ہیں اور جذبہ اور تاثیر کی گہرائی اور اندازِ بیان کے تیکھے پن کے اعتبار سے بھی انھیں ایک دوسرے پر ترجیح دینا ذرا دقت طلب ہے۔ بات یہ ہے کہ نظم اور غزل کے آداب مختلف ہیں اور بعض اوقات غزل کے محدود رقبہ میں تجربات کا عطر اس طرح سمٹ آتا ہے جس کے لیے نظم کی پہنائی بھی تشنہ معلوم ہوتی ہے۔

غزل کے سلسلے میں یوں تو بحث کا آغاز حالی کے زمانہ ہی میں ہو گیا تھا جس کے تاریخی اور معاشرتی اسباب تھے مگر ہمارے دور میں غزل کے ہر ہر پہلو کو پرکھا گیا ہے اور غزل پر تمام اعتراضات اور الزامات کو تسلیم کرنے کے بعد بھی اس کی بے اندازہ مقبولیت اور تجدید حیرت انگیز ہے۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل کو ہمارے قومی مزاج سے ایک ہم آہنگی ہے جس کی وجہ سے ہم ہزار پارسائی کے باوجود اس بت ہزار شیوہ کو مڑ مڑ کر للچائی نظروں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ کافی اہم ہے کہ غزل کے اشاروں میں اپنی کہنگی کے باوجود ابھی تک اتنی توانائی ہے کہ ان کے ذریعہ ہم ان بہت سے مسائل کو جن پر آج ہماری نگاہیں جمی ہوئی ہیں۔ ستر پردوں کے باوجود لطف اور معنی خیزی کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں۔ یہ دعویٰ ممکن ہے نیا ہو مگر اس کا ثبوت متقدمین اور متاخرین کے کلام سے بھی ملتا ہے۔ یہ دعویٰ آج شد و مد کے ساتھ اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اب زندگی کے مطالبات بڑھ گئے ہیں اور ہم ان کا زیادہ واضح اور کھلا ہوا احساس رکھتے ہیں۔ داخلی جذبات و احساسات کی مصوری کے لیے غزل کی دور بینی جس درجہ کامیاب رہی ہے اس سے اختلاف اور انکار کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے؟

اعظمی صاحب کے سلسلے میں میں نے شروع میں اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ وہ غزل کی روایت سے پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کی ابتدائی غزلوں میں روایت کا یہ رنگ جھلکتا ہے۔ ہماری اردو شاعری میں غزل کے اسکول اور اس کے رنگ تو کئی ہیں لیکن محبت کی شاعری کے اعلیٰ نمونے کم ہیں۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ اول تو یہ کہ ردیف اور قافیہ کی قید نے بعض ایسی آسانیاں پیدا کر دی ہیں جن کی وجہ سے شاعری کا عمل کچھ آسان سا ہو گیا ہے۔ دوسرے یہ کہ غزل کے موضوعات میں یکسانیت کارفرما رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ جن عشقیہ جذبات و کیفیات سے ان غزلوں کا خمیر اٹھا ہے وہ سماجی پابندیوں کی وجہ سے اپنی اصلی، صحت مند اور روح پرور حالت میں پروان نہیں چڑھ سکے اور چوتھے یہ کہ بحیثیت مجموعی غزل کے بہت سے شاعر موضوع [illegible]
ہیئت کی طرف زیادہ متوجہ رہے ہیں۔ یہ حقیقت ایک حد تک ناقابلِ تردید ہے [illegible] مری

دنیا ہزار گہرائی اور گیرائی کے باوجود ذرا سمٹی اور سکڑی ہوئی ہوتی ہے لیکن انسانی فطانت بعض اوقات تمام موانعات کو شکست دے کر اپنی شرائط منوانا چاہتی ہے اور خود فارم میں تبدیلی اور توسیع کے راستے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ پرانے اساتذہ میں میر، غالب اور آتش اور جدید شعرا میں اقبال، حسرت اور فراق غزل کے میدان میں ایک ایسا امتیاز رکھتے ہیں جن کی وجہ سے اردو غزل کی آبرو قائم رہ سکی ہے۔ دراصل ادبی تنقید میں ریاضیاتی فارمولے زیادہ کارآمد نہیں ہوتے۔ کسی ایک فارم میں بالطبع تمام محاسن موجود نہیں ہوتے۔ فارم خود ایک اچھے فن کار کے ہاتھوں میں پہنچ کر ہی اپنے تمام امکانات اور ساری قوتوں کو بروئے کار لاتی ہے۔ اس لیے دراصل نظم اور غزل دونوں ہمارے ذوق کو آسودہ کرتی اور ہمارے بعض مطالبات کو پورا کرتی ہیں اور دونوں کو فنکارانہ طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

غزل کے بیشتر شاعر اپنی نجی کائنات میں جکڑے رہے ہیں اور اسی لیے ان کے موضوعات میں تنوع کی کمی کا احساس دامنگیر ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ جذبات حسن وعشق بھی انتہائی پیش پا افتادہ مواد فراہم کرنے کے باوجود نئے زاویوں سے دیکھے اور پرکھے جاسکتے ہیں اور ان کے نازک امتیازات کی نقش گری میں شاعری کا کمال ابھرتا ہے۔ جدت پسندی کا مفہوم اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ پہلے یہ منحصر تھی لفظی صنائع پر، اب اس کا اطلاق ہونے لگا ہے نقطۂ نظر کی انفرادیت پر ہی مختلف شاعروں کے درمیان مابہ الامتیاز بن سکتی ہے کیونکہ وہ خام مواد جسے شاعر اپنے محاکات کے ذریعہ پیش کرنا چاہتا ہے یعنی انسانی جذبات واحساسات وہ کم وبیش سب کے لیے یکساں ہوتے ہیں اور ان کے خط وخال میں بہت واضح اختلافات نہیں ہوتے ہاں جب شاعر ان کی مصوری کی کوشش کرتا ہے تو پھر وہ اپنے ذہنی معیار، جذباتی زرخیزی اور اپنے ادراک کی لطافت کے مطابق انھیں پیش کرتا ہے۔ جذبات کی مصوری کے علاوہ امتیاز اور تفریق کے اور بھی کئی پیمانے ہوسکتے ہیں مثلاً محبوب کا کردار، اس کائنات کی فضا جسے شاعر نے تخلیق کیا ہے۔ اس کے عشق کا ہمہ گیر انسانی اقدار سے رابطہ اور خود ان جذبات کی تہیں اور پیچیدگیاں جن سے شاعر نے ایک تانابانا (Pattern) تیار کیا ہے۔ عشقیہ شاعری میں صرف شدت اور خلوص کافی نہیں ہیں۔ محض اندازِ بیان یا تاثر آفرینی کو آخری قدر نہیں مانا جاسکتا بلکہ میرا خیال ہے کہ حسن وعشق کی نفسیات کو جس طرح شاعر نے پیش کیا ہے اور اس سے مجموعی طور پر جو نظریہ ابھرتا ہے وہ دوسرے سطحی محاسن کے مقابلے میں زیادہ اہم ہے۔

اعظمی صاحب کی غزلوں میں سیاسی حالات کی طرف اشارے یا معرفت کے رموز تو نہیں

ملیں گے البتہ غزل کے محدود میدان میں وارداتِ قلب کی دلنشیں اور پرکیف تصویر کشی ضرور نظر آئے گی جسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے ایک خاص روایت کو اپنانے کے باوجود اپنا ایک الگ انداز نکالنے کی سعی کی ہے۔ غزل کے ہر شعر میں چونکہ ایک مکمل بات کہنے کی کوشش کی جاتی ہے یا ایک خاص کیفیت کے عطر کو مختصر ترین الفاظ میں سمویا جاتا ہے۔ اس لیے جستہ جستہ اشعار سے بھی غزل گو شاعر کے نقطۂ نظر کا تعین ممکن ہے۔ اعظمی صاحب کی غزلیں اس فارم کے آداب کو پوری طرح پیش کرتی ہیں اور روایت کے رنگ سے میرا یہی مطلب ہے۔ ویسے ان کی بنیاد گہرے، شدید اور ذاتی تجربوں اور احساسات پر قائم ہے۔ ہمارا ہر شاعر سے یہ مطالبہ کہ وہ خالص عشقیہ واردات میں بھی کچھ سیاسی یا فلسفیانہ رنگ آمیزی ضرور کرے درست نہیں ہے۔ ہاں اگر شاعر کے ذہنی افق پر یہ رنگ چھایا ہوا ہے تو وہ بلا کسی شعوری ارادہ کے بھی جذبات کی مصوری میں جھلک اٹھے گا۔ اعظمی صاحب کی غزلوں میں اگر یہ رنگ گہرا یا بالکل نہیں ہے تو ہم اس پر کیوں اصرار کریں۔ یہ ارضی محبت کے ترانے ہیں جن کا سوز و گداز اور جن کی اصلیت اور طرفگی ان کا اصلی جوہر ہیں۔

جنوں میں یوں تو کچھ اپنی خبر ملتی نہیں ہم کو
اک ایسا نام ہے جس پر ابھی تک دل دھڑکتا ہے

رنگ لایا تو ہے اک قطرۂ شبنم کا گداز
دلِ افسردہ میں اب کوئی شرر ہو کہ نہ ہو

زخم کھا کھا کے سنورتی ہی چلی جاتی ہے
میری دنیا نہیں یہ کوئی دلہن ہے صیاد

سنا رہا ہوں انھیں جھوٹ موٹ اک قصہ
کہ ایک شخص محبت میں کامیاب رہا

جب پڑا غم تو بدلتی ہی نہیں یہ دنیا
جا کے اب بیٹھ رہی گردشِ ایام کہیں

شامِ فراق صبحِ قیامت سے مل گئی
اب غم کی سرزمیں پہ کوئی آسماں نہیں

بہت اکتا گیا ہے جی خردمندوں کی صحبت سے
کوئی دیوانہ ہاتھ آیا نہیں ہے ایک مدت سے

دامن کے چاک چاک میں ہے موسمِ بہار
آؤ کہ خونِ دل سے کریں گلفشانیاں
تشنگی محفلِ خوباں میں تو کیا خاک بجھی
پھر بھی بیٹھا ہوں کہ شاید ہو یہیں آبِ حیات

میں نے دیکھی ہے وہ اک ساعتِ نایاب بھی جب
جسم اور روح میں کچھ فرق نہیں رہتا ہے

تھے اگرچہ سب امیدوں کے چراغ روٹھے روٹھے
تری یاد کے اجالے میں گزار دی ہیں راتیں

غمِ حیات کی ظلمت میں ہائے وہ لمحے
چمک چمک سی اٹھی ہے کبھی جو تیری جبیں

رو دھو کر چپ رہنے پر بھی
دل چھلکے ہے پیمانہ سا

وادی وادی میں مہکتی ہے تری زلف رسا
کتنی راہوں پہ ابھی مجھ کو سفر کرنا ہے

بارہا تیرے نامرادوں کو
موت آواز دے کے پچھتائی

میں نے اوپر اعظمی صاحب کی نظموں اور غزلوں کے وحدتِ مزاج کا ذکر کیا تھا۔ اس کا بیّن ثبوت وہ چند غزلیں ہیں جو میر کے انداز میں کہی گئی ہیں۔ غزل کی دنیا میں میر کے اثرات

بہت ہمہ گیر ہیں تھی کہ غالب نے بھی ان کی استادی کو تسلیم کیا ہے۔ ہمارے زمانہ میں غزل کے احیا کے ساتھ میر کے انداز میں غزل کہنے کو بھی فروغ ہوا ہے۔ کسی صاحبِ طرز اور منفرد و ممتاز شاعر کے لہجہ کو اپنانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کہ دونوں شاعروں کے درمیان مزاج، بصیرت اور شعور کی ہم آہنگی نہ ہو۔ غالب اور اقبال کا تتبع کرنے والوں کا جو حشر ہوا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ میر، غالب اور اقبال کی نسبت فکری اعتبار سے کم پیچیدہ اور پہلو دار ہیں لیکن میر کا سا سوز و گداز، ان جیسی سادگی اور پُرکاری، ان جیسے تیور اور رکھ رکھاؤ، ان جیسی شدتِ احساس اور نشتریت محض ارادتاً یا تقلید کے طفیل نصیب نہیں ہو سکتی۔ میر کے رنگ میں جو غزلیں اس زمانے میں کہی گئی ہیں ان میں اعظمی صاحب کی کوششیں بلا خوف تردید سب سے زیادہ کامیاب ہیں۔ یہ غزلیں اس نوجوان شاعر کا قابلِ رشک کارنامہ ہیں اور اچھے سے اچھے انتخاب میں جگہ پانے کا حق رکھتی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اعظمی صاحب نے شعوری طور پر میر کے شیوۂ بیان کو اپنانے کی کوشش کی ہے یا نہیں۔ میرا قیاس نفی میں ہے۔ واقعہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میر کے گہرے مطالعہ سے ان کے لب و لہجہ کا اثر اعظمی صاحب میں رچ بس گیا ہے اور چونکہ انھوں نے یہ غزلیں اپنے آپ میں ڈوب کر کہی ہیں اس لیے ان کے تاثر اور ان کے مزاج میں میر کا رنگ آ گیا ہے۔ ان غزلوں میں جو رچا ہوا غم ہے، گھائل زخموں کے جو نشتر ہیں، جو خلش اور کسک ہے، جو سپردگی اور معصومیت ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جو ضبط و توازن ہے وہ کامیاب حزنیہ شاعری کے ماتھے کا جھومر ہے۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اعظمی صاحب کی نظموں میں جو واردات تفصیل سے بیان کی گئی ہے ان کی روح ان غزلوں میں کھنچ آئی ہے اور اسی لیے ان میں رمزیت اور ایمائیت کے جوہر چمک اٹھے ہیں۔ ان غزلوں کی ایک اور خوبی ان کی مخصوص فضا ہے۔ غزل پر عام طور سے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان میں کیفیات اور احساسات کا انتشار اور پراگندگی پائی جاتی ہے یہ خامی بھی ان غزلوں میں نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایک ہی جذبہ سے سرشار ہیں جو شاعر کی شخصیت پر مستولی ہے۔ جو بات ان غزلوں کو اور دوسری غزلوں سے ممیز کرتی ہے وہ یہ کہ اُن میں جذبات ایک نوع کی پختگی اور عمومیت اختیار کر چکے ہیں اور خود بخود الفاظ کے سانچوں میں ڈھل گئے ہیں۔ اعظمی صاحب کے یہاں مینا کاری کا احساس کہیں بھی نہیں ہوتا۔ موزونیت، ترنم اور بے ساختگی کا ثبوت قدم قدم پر ملتا ہے۔ ان غزلوں کا چٹیلا پن، زورِ بیان اور کاوش کا مرہونِ منت نہیں بلکہ شاعر کے حیات کی گہرائی اور اس کی ناکامیوں اور اداسیوں کے سرچشمے سے پھوٹا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

مرے سازِ غم پہ چھیڑو نہ یہ نغمۂ بہاراں
مجھے راس آ گیا ہے یہ لباسِ سوگواراں
مجھے قتل کر کے سیکھے ہیں وہ یہ رسم دردمندی
ہیں بڑے ہی بھولے بھالے یہ مرے جفاشعاراں
مجھے کچھ ہوا نہیں ہے یونہی پھٹ گیا گریباں
مجھے دیکھ دیکھ سوچو نہ کچھ اور غمگساراں

خوار ہوئے بدنام ہوئے، بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے
ترکِ محبت بھی کر دیکھیں حال ہمارا کیا ہوگا
اس کی ایک جدائی پر تو رگ رگ میں ناسور ہوئے
کون تری زلفوں کو چھیڑے کون گلابی چھلکائے
تیری گلی سے ہم کیا نکلے سب جلوے مستور ہوئے

بہت فسردہ ہیں ان کو کھو کر جگر فگاروں سے کچھ نہ کہنا
نہ جانے کیا ان کے دل پہ بیتے گی سوگواروں سے کچھ نہ کہنا
کبھی نہ بھولیں گی ایسی گھڑیاں، یہ سخت تنہائیوں کے لمحے
گزارنی ہجر کی یہ راتیں مگر ستاروں سے کچھ نہ کہنا
یہ دردِ غربت، یہ اشک پیہم، یہ اجنبی شہر کی ہوائیں
مگر جو وہ میرا حال پوچھیں تو میرے پیاروں سے کچھ نہ کہنا

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں
یاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو چاہ کے ارماں ہیں
فرصت ہو تو آ کر دیکھو ہم آوارہ گردوں کو
کتنے غبار ہیں اس دامن میں، کتنے دل میں طوفاں ہیں
اہلِ زمانہ کو بس میری اک رسوائی یاد رہی
ورنہ میری وفا کے جانے کتنے اور بھی عنواں ہیں

خیر سے اب کے اہلِ ستم کو دیوانوں سے کام پڑا
دیکھیں کتنی زنجیریں ہیں، دیکھیں کتنے زنداں ہیں
اک اک بوند جلی ہے لہو کی تب جاکر یہ رات کٹی
تیرے لیے اے صبحِ طرب ہم کب سے چاک گریباں ہیں

تمام یادیں مہک رہی ہیں، ہر ایک غنچہ کھلا ہوا ہے
زمانہ بیتا مگر گماں ہے کہ آج ہی وہ جدا ہوا ہے
یہ سچ ہے کھائے ہیں میں نے دھوکے مگر نہ چاہت سے کوئی روکے
بجھے بجھے سے چراغِ دل میں بھی ایک شعلہ چھپا ہوا ہے
یہ درد ابھرا ہے عہدِ گل میں خدا کرے جلد رنگ لائے
نہ جانے کب سے سلگ رہا ہے، نہ جانے کب کا دبا ہوا ہے
ہر ایک لے میری اُکھڑی اُکھڑی سی دل کا ہر تار جیسے زخمی
یہ کون سی آگ جل رہی ہے، یہ میرے گیتوں کو کیا ہوا ہے

اعظمی صاحب کے کلام کا یہ مجموعہ اردو شاعری کے مستقبل کے لیے نیا شگون ہے۔ ان کی نظمیں ان کے بیدار اور جدید شعور کی آئینہ دار ہیں اور ان کی غزلوں میں وہ کیفیت وارفتگی اور سوز و ساز ہے جو اپنے جذبات کا عرفان حاصل کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ ان کی نظموں میں ایک صحت مند خارجیت اور ارتقا کا ایک تصور ملتا ہے۔ ان کی غزلیں اپنے زخموں اور ناسوروں کو کرید کر مشاہدہ کرنے سے وجود میں آئی ہیں۔ وہ اپنے محبوب کے سامنے سراپا عجز اور سپردگی ہیں۔ بے التفاتی، پندار یا طنز خود ان کی شخصیت ہی میں کہاں ہے کہ وہ اس کا مظاہرہ محبوب کے ظلم و ستم کے مقابلہ میں روا رکھیں۔ ان کے یہاں حسن کا احساس، جذبات کی پختگی اور پائندگی اور فن کی برگزیدگی اور ریاض بھی ملتا ہے مگر آراستگیٔ بیان کو ان کے یہاں وہ دخل نہیں جو بعض فنکاروں کے پاؤں کی بیڑی بن کر رہ جاتا ہے اور ذہن کو نئے راستوں پر پڑنے سے روکتا ہے۔ انھوں نے اپنے تجرباتِ زندگی کو انتہائی ہنرمندی، بے پایاں خلوص اور بے حد موثر انداز میں پیش کیا ہے مگر ابھی تک ان کے یہاں جذبہ فکر میں تبدیل نہیں ہوا ہے۔ اس کے لیے مشاہدہ اور تجربہ کی وسعت، رنگارنگی اور تنوع کے ساتھ مطالعہ کی گہرائی اور اس نظر کی بھی ضرورت ہوتی ہے جو حقائق اشیا کو اپنی گرفت میں لا سکے۔

نوجوان شاعروں میں اعظمی صاحب کا مقام بہت بلند ہے اور ان کے سامنے امکانات کا میدان کھلا ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو صرف نظم یا صرف غزل تک محدود نہیں رکھا ہے اور ایک صحت مند اقدام ہے۔ اعظمی صاحب ان شا۔ ۔ میں ہیں جن کے لیے موضوع کی اہمیت ہیئت کے مقابلہ میں کسی قدر زیادہ ہے۔ ان کی تصویر کشی بڑی نادر اور دلکش ہوتی ہے اور غیر متوقع طور پر ادراک پر اثر انداز ہوتی ہے۔ ان کے نغموں میں ایک ایسی شادابی، رعنائی اور سادگی ہے جو جنگلی پھولوں میں ہوتی ہے۔ ان میں وہ تڑپ اور جلن ہے جو دل کے زخموں سے کھیلنے سے حاصل ہوتی ہے۔ ان میں وہ گداز، گمشدگی اور بیکراں المیت ہے جو زندگی کے غموں کو انگیز کرنے اور گوارا بنانے سے ہاتھ آتی ہے لیکن ان کا یہ گہرا اور محیط غم روح کو گھلاتا نہیں اس میں ترفع اور انبساط پیدا کرتا ہے۔ اعظمی صاحب کے یہاں اگر ذہنی ارتقا قائم رہا اور جذباتی فراوانی باقی رہی تو یقین ہے کہ ان کے کلام میں خیالات و احساسات کے نئے رابطے پیدا ہوں گے۔ یہ شاعری اگر پوری توانائی اور قوتِ نمو کے ساتھ برگ و بار لا سکی تو ان بلندیوں کو چھو لے گی جن کا ابھی صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

اسلوب احمد انصاری

شعبۂ انگریزی
مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نیا عہد نامہ

راشدہ مریم کے نام

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد زبادِ صبح
در کار زندگی صفتِ سنگِ خارا ایم

دیباچہ

غالباً فروری 1946 کی بات ہے۔ میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ ایک دن اچانک میں نے اپنے دل میں ایک ایسی خلش محسوس کی جس کا سبب مجھے خود نہیں معلوم تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے مجھے کسی سے محبت ہوگئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ محبوبہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ نہ تو اس کی کوئی شکل وصورت تھی اور نہ کوئی نام اور پتہ، مگر ایک مبہم سی کسک نے میرے اندر ایک تبدیلی سی پیدا کردی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے مجھے ایک گوشۂ تنہائی کی ضرورت ہے جہاں میرے ہم سبق اور عزیز ترین دوست بھی نہ ہوں۔ لیکن اس زمانے میں زندگی کچھ اس ڈھب سے گزر رہی تھی جہاں اسی ایک گوشے کی بے حد کمی تھی۔ میں ایک ایسے ہوسٹل میں رہتا تھا جہاں میرے ساتھ کئی اور ساتھی میرے کمرے میں مقیم تھے۔ رات گئے تک ہم سب یا تو کتابیں پڑھتے یا گپ شپ اور لطیفے بازی ہوتی۔ گیارہ بارہ بجے جب کمرے کی روشنی گل کرکے ہم سب اپنے اپنے بستروں میں چلے جاتے تو مجھے وہی بے نام صورت یاد آنے لگتی اور میں اس کے خیال میں رات کے پچھلے پہر تک جاگتا رہتا۔ کئی بار ایسا لگا کہ میں اس کو ایک لمبا چوڑا خط لکھنا چاہتا ہوں مگر پھر سوچتا کہ یہ کیا حماقت ہے۔ کس کو خط لکھوں گا اور کہاں بھیجوں گا۔ اِنھیں کیفیتوں سے گزر رہا تھا کہ ایک روز کلاس میں بغیر کسی ارادے کے سب سے پچھلی بنچ پر جا بیٹھا۔ میں اس سے پہلے اس بنچ پر کبھی نہیں بیٹھا تھا کیونکہ عام طور پر وہاں میرے وہ ساتھی بیٹھتے تھے جنھیں نصاب کی کتابوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہ لوگ اپنی کاپیوں پر دوستوں کی تصویریں یا کارٹون بناتے یا ڈیسک کی اوٹ میں رکھ کر کوئی ناول یا افسانے کی کتاب پڑھا کرتے۔ میں بھی اپنی نوٹ بک پر ساتھیوں کی نظریں بچا کر کچھ لکھنے لگا۔

بعض نے میری طرف توجہ کی لیکن یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ میں شاید استاد کے دیے ہوئے لیکچر کے نوٹس لے رہا ہوں۔ کلاس ختم ہونے کے بعد میں نے اپنے چند بے تکلف دوستوں سے یہ انکشاف کیا کہ میں نے ابھی ابھی ایک نظم لکھی ہے۔ نظم کا عنوان تھا ''نقش ناتمام'' اور وہ اس طرح شروع ہوتی تھی:

پیکرِ حسن و حیا آہ یہ تصویر تری
میری تخئیل کا ہے ایک ادھورا شہ کار

یہ نظم سب نے پسند کی اور سننے کے بعد اپنے جو تاثرات ظاہر کیے ان سے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اس نظم کے ایسے معنی و مفہوم نکالے ہیں جن کا علم خود مجھے بھی نہیں تھا۔ خیر وہ نظم میں نے چپکے سے ایک لفافے میں رکھ کر ممتاز شیریں کو بھیج دی جو اس زمانے میں بنگلور سے ''نیا دور'' نام کا ایک دوماہی رسالہ نکالتی تھیں۔ کوئی ایک ہفتے کے بعد ان کا خط آیا کہ نظم انھیں بہت اچھی لگی ہے اور وہ ''نیا دور'' کے شمارہ نمبر 8 میں شائع ہوگی۔ اس خط کے موصول ہونے کے بعد میرا کچھ ایسا معمول ہو گیا کہ چلتے پھرتے نظموں کے خیال اور ان کے عنوان ذہن میں گونجنے لگتے اور مجھے انھیں کاغذ پر منتقل کرنے کی فکر رہتی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ رات میں جب میرے کمرے کے ساتھی روشنی گل کر کے سو گئے تو اس خیال سے کہ ان کی نیند میں خلل نہ پڑے میں نے اندھیرے میں ہی کسی پنسل سے نظم لکھ ڈالی۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو کاغذ پر ساری سطریں اور سب الفاظ ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں عجیب عجیب نظمیں کہیں ''زلیخا کی آنکھیں''، ''آدرش''، ''اجنبی سائے''، ''تخئیل کے دیوتا''، ''خیام کے نام''، ''حبس دوام'' اور جانے کیا کیا عنوان ہوتے تھے۔ یہ سب نظمیں پہلے دوستوں کو سنائیں۔ ان کی تعریف اور ان کے بتائے ہوئے مطلب سن کر خوش ہوا اور پھر انھیں رسالوں میں چھپنے کے لیے بھیجیں۔ ''حبس دوام'' کے عنوان سے جو نظم تھی وہ میرے ایک دوست نے جو پٹنہ کے رہنے والے تھے کسی طرح کلیم الدین احمد کے پاس بھجوائی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف نے یہ نظم بہت پسند کی ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ ''معاصر'' میں چھپی۔

جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت میں اور میرے دوست اردو کے جو رسالے پابندی سے پڑھا کرتے تھے وہ ادبی دنیا، ہمایوں، نیا ادب، ساقی اور ادبِ لطیف وغیرہ تھے۔ اردو کے جدید شاعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں اور ان کے ارتعاشات میں اپنے جسم و جان میں محسوس کر رہا تھا۔ نظم میں اسلوب اور ہیئت کے نت نئے تجربے ہو رہے تھے اور جی یہ چاہتا تھا

کہ جو نظم لکھی جائے وہ نئی سے نئی ہو۔ اس کوشش میں ایسا ہونے لگا کہ میری نظموں میں دھند لکا اور بڑھ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے میں جو خلش اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں وہ کاغذ پر منتقل نہیں ہو رہی ہے۔ ایک عجیب طرح کی نارسائی اور ناتمامی کا احساس دامن گیر ہوتا۔ انھیں دنوں کی بات ہے کسی صحبت میں میری تازہ ترین نظم اور دوستوں کے تجزیے سننے کے بعد میرے ایک ہم سبق اور عزیز دوست علی حماد عباسی نے مجھ سے کہا کہ جب تم اپنا مجموعۂ کلام چھپوانا تو ان نظموں کے ساتھ ان کی شرح بھی شائع کر دینا کیونکہ تم یا تمھارے بعض دوست ان کے جو معنی سمجھ رہے ہیں وہ دوسروں کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ میں نے عباسی کی یہ بات اس وقت تو ہنس کر ٹال دی لیکن پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں نے کچھ دنوں کے لیے خاموشی اختیار کر لی اور روزانہ نئی نظمیں لکھنے کا جو پروگرام تھا وہ ختم ہو گیا۔

ایک روز ''نگار'' کا ایک پرچہ پڑھ رہا تھا کہ لمۃ الرؤف نسرین کا یہ شعر نظر سے گزرا:

آئینہ دیکھ کر خیال آیا
تم مجھے بے مثال کہتے تھے

اس شعر نے مجھے نہ جانے کس عالم میں پہنچا دیا۔ بظاہر اس سادہ سے شعر میں کتنی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب غزل کے ایک شعر نے مجھ پر ایسا جادو کیا۔ ان دنوں بعض تنقیدی مضامین اور نئے ادیبوں کی تحریریں پڑھ کر قدیم اردو شاعری بالخصوص غزل کی طرف سے میں بدگمان ہو گیا تھا اور نئی شاعری اور نئی نظم کے لیے نومسلموں کا سا جوش رکھتا تھا لیکن اس ایک شعر نے تو جیسے دنیا ہی بدل دی۔ میں نے پرانے شعرا کے دواوین اور کلیات پڑھنے شروع کیے اور کچھ دنوں کے لیے ان میں ڈوب سا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے میں نے ان شعرا کو ازسرِ نو دریافت کیا ہے کیونکہ میرے بعض تاثرات ایسے ہوتے جو عام اور مروجہ تنقیدوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اسی کیفیت نے میری تنقید نگاری کو جنم دیا۔ میری تنقید نگاری میری داخلی ضرورتوں کی پیداوار تھی۔ یہ داخلی ضرورتیں میری اپنی شاعری سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں کچھ ایسی کیفیتوں سے گزر رہا تھا جو بہت سے مصرعے کہنے کے بعد بھی اَن کہی سی رہ جاتی تھیں۔ انھیں سے ملتی جلتی کیفیات کو دوسرے شعرا کے یہاں تکمیل یافتہ صورت میں دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ میں نے ان شعرا ہی کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو پالیا ہے۔ روایت اور جدیدیت کے سلسلے میں ایک واضح شعور تو ذرا بعد میں پیدا ہوا جب مجھے انگریزی ادب کے مطالعے کا موقع ملا لیکن قدیم اور جدید شاعری کے تصادم، ان کے اثرات کے امتزاج اور ان کی باہمی ترکیب سے اسی زمانے میں مجھے اس لہجے کو پانے میں

مدد ملی جو میرے اوپر گزرنے والی واردات کا ساتھ دے سکتا تھا۔ کم از کم اپنی حد تک مجھے یہ اطمینان ہونے لگا کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے وہی کہا ہے اور اب نظم یا شعر کو سنانے کے بعد اس کی مزید تشریح و توضیح کی زحمت خود مجھے نہیں اٹھانی پڑے گی۔

آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس کے بعد بھی میرے بعض احباب میری نظموں یا میرے شعروں میں ایسے عناصر دریافت کر لیتے جن سے میں بے خبر ہوتا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے دوست اصغر عباس زیدی سے رجوع کیا جو مجھ سے عمر میں بڑے تھے اور ایم۔ اے کے طالب علم تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ محسوسات اور اظہار و ابلاغ کے درمیان کئی ایسی منزلیں ہوتی ہیں جب خود بخود کسی نظم یا شعر میں ایسے عناصر داخل ہو جاتے ہیں جن کا شاعر کی شعوری کوشش سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عمل بہت پُراسرار طور پر ہوتا ہے اور یہی پُراسراریت کسی شعری کارنامے میں تہہ در تہہ کیفیت پیدا کرتی ہے اور اس کے معنی و مفہوم میں اتنی وسعت آجاتی ہے کہ لوگ اپنے اپنے طور پر بھی انھیں دریافت کرتے ہیں اور آنے والی نسلیں بالکل نئے انداز میں ان سے لطف اندوز ہوتی اور نئے نئے معانی پہناتی رہتی ہیں۔

میری شاعری ابھی ابتدائی منزلوں سے گزر رہی تھی۔ علی گڑھ میں نئے ادب اور نئے افکار سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کا ایک خاص حلقہ بن گیا تھا جس میں اشعر ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، فرید بخش قادری، سید منہاج الدین، باقر مہدی، اصغر عباس، تصور حسین زیدی، سید یوسف حسن اور ریاض الدین قیصر وغیرہ شامل تھے۔ ہم میں سے بعض فرسٹ ایئر اور سیکنڈ ایئر کے طالب علم تھے اور بعض بی۔ اے اور ایم۔ اے میں پڑھتے تھے لیکن ادب کے جنون نے ہم سب کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا۔ ہم میں سے بعض نظم یا نثر کی کسی صنف میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ بعض ایسے تھے جو کچھ نہ لکھنے کے باوجود شعر و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے اور اسی کی فضا میں سانس لیتے تھے۔ اُنھیں دنوں ہم سب نے مل کر علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی جس کے جلسے ہر ہفتہ الحمرا ریستوراں میں ہونے لگے۔ اس وقت ہمارے سامنے ترقی پسندی کا وہ محدود اور مخصوص تصور نہیں تھا جو آگے چل کر کل ہند پیانے پر سامنے آیا۔ یہی سبب ہے کہ ان جلسوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین، اختر انصاری، جذبی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین، خورشید الاسلام، سلامت اللہ خاں اور اسلوب احمد انصاری جیسے مختلف الخیال حضرات شریک ہوتے۔ ان جلسوں میں ہم سب اپنی لکھی ہوئی چیزیں سناتے جن پر ہمدردانہ تنقیدیں ہوتیں اور تشریح اور تجزیے سے اس کے کئی

آتے۔ میں نے اپنی ادبی تربیت کے سلسلے میں اس حلقے کے دوستوں اور اس انجمن میں شریک ہونے والوں سے بہت فائدہ اٹھایا۔

جس خوشگوار ذہنی فضا اور ادبی ماحول کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ بدقسمتی سے تقسیم ہند کے بعد درہم برہم ہو گیا۔ اس کے بعد میری ذاتی زندگی اور تخلیقی اُپج کو جس کرب واضطراب، کشمکش و تصادم اور جن واقعات و حادثات سے دوچار ہونا پڑا اس کی داستان بڑی طویل ہے۔ ستمبر 1947 میں دہلی سے علی گڑھ آتے ہوئے ٹرین میں میں نے اپنی موت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ ہوش آیا تو اپنے آپ کو جامع مسجد کے ایک ریلیف کیمپ میں پایا اور پھر اس کے بعد جامعہ ملیہ میں تین مہینے تک حیات و مرگ کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس واقعے سے جانبر ہونے کے بعد نومبر 1947 کے آخر میں پھر علی گڑھ واپسی ہوئی۔ یہاں آکر مجھ پر کچھ دنوں تک عجیب کیفیت طاری رہی۔ راتوں کو گہری نیند میں چیخ چیخ اٹھتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی آسیبی قوت میرے سینے پر سوار ہو کر مجھے ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا چاہتی ہے۔ آہستہ آہستہ یہ کیفیت کم ہوتی گئی لیکن اس کا اثر اب تک کسی نہ کسی صورت میں باقی ہے۔ روزانہ تو نہیں لیکن چھٹے چھ ماہے اب بھی یہ آسیب مجھے اپنی صورت دکھا جاتا ہے۔

میری زندگی کا یہ دور میری ذہنی تنہائی کا دور تھا۔ میرے پرانے دوست اور ساتھی ایک ایک کر کے علی گڑھ سے جا چکے تھے اور میں ان کو یاد کر کے اداس ہو جاتا تھا۔ ریستوراں میں، راستوں اور گزرگاہوں پر نگاہیں مانوس چہروں کو ڈھونڈھا کرتیں اور ٹکرا کر واپس آجاتیں۔ میری صبح و شام اب کاٹے نہیں کٹتی تھی اور ہر لحہ یہ کیفیت کہ ؎

اِس آشیاں میں صدا دی اُدھر پکار آئے

اُس زمانے میں کئی مہینے ایسے گزرے جب میری زبان گنگ ہو گئی، مجھ پر جو کچھ بیت چکی تھی اور بیت رہی تھی اس کے اظہار سے مجھے خوف سا آنے لگا۔ اپنے جذبات و احساسات کو چھوتے ہوئے ڈر سا لگتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں لا کر پڑھتا تھا مگر اس سے بے چینی کا علاج ہونے کے بجائے دل کی ویرانی میں اور اضافہ ہو جاتا۔

اُنھیں دنوں ''کلیات میر'' کے مطالعے کے دوران مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری داخلی دنیا میں کچھ دریچے کھل گئے ہیں جن سے ہو ہو کر ایسی ہوائیں آرہی ہیں جو مجھے محبت و رفاقت، خلوص و ہمدردی اور دلدہی و دلآسائی کا پیغام دے رہی ہیں۔ میں نے اس کلیات کو اپنے سینے سے لگایا اور اس آئینے میں اپنی ذات کا مشاہدہ کرنا میرا معمول بن گیا۔ میر اردو کے برگزیدہ اور قابلِ احترام

شاعر ہیں۔ ان کی تقلید و پیروی کو غالبؔ جیسے انانیت پسند شاعر نے باعث فخر و مباہات سمجھا ہے، مگر میں میرؔ کے پاس ان کی بزرگی و برگزیدگی یا ان کے ادبی مرتبے کی بنا پر نہیں گیا تھا اور نہ مجھے ان کے ہاتھ پر بیعت کر کے اپنی مغفرت کا وسیلہ تلاش کرنے کی آرزو تھی۔ میرؔ سے میری شناسائی تو ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ وہ ایک خاص کیفیت میں میرے غمگسار بن گئے اور میں ان کی صحبت میں بیٹھ کر تنہائی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے لگا۔ میرؔ کے بارے میں میں نے پڑھ رکھا تھا کہ وہ ہائے وائے کے شاعر ہیں، ان کے یہاں غم پرستی اور قنوطیت ہے، وہ بے دماغ یا بد دماغ تھے اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ مگر میں نے میرؔ صاحب کو اس کے برخلاف پایا۔ مجھے ان کے یہاں غم پرستی کے بجائے غم سے نبرد آزما ہونے اور اس کے زہر سے امرت نکالنے کا سلیقہ نظر آیا۔ مردم بیزاری اور کلبیت کے بجائے انسان دوستی، فراخ دلی، وسیع المشربی، زندہ رہنے اور زندگی سے نباہ کرنے کا ہنر دکھائی دیا۔ مجھے ایسا لگتا جیسے ان کو بھی اپنے زمانے میں اسی نوع کی تنہائی سے واسطہ پڑا تھا۔ انھوں نے بھی اپنے سامنے ایک بساط کو الٹتے اور ایک بھری پُری بزم کو درہم برہم ہوتے دیکھا تھا اور اس کے باوجود بھی انسان اور انسانی زندگی پر ان کا اعتماد باقی رہا۔ میرؔ کی آواز کو اپنی آواز سمجھنا میرے لیے محض غزل گوئی یا شاعری کا راستہ نہیں تھا بلکہ یہ میری پوری زندگی کا مسئلہ تھا۔ اس آواز کا سُراغ مجھے نہ ملتا تو میری روح کا غم جو اندر سے مجھے کھائے جا رہا تھا نہ جانے مجھے کن اندھی وادیوں کی طرف لے جاتا۔

ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا اور میں اپنے کھوئے ہوئے حواس مجتمع کر ہی رہا تھا کہ علی گڑھ میں نوجوانوں کے نئے نئے قافلے آنے شروع ہو گئے اور ترقی پسند ادیبوں کی انجمن پھر ایک نئے ولولے کے ساتھ بیدار ہو گئی۔ جانے والے کارواں کی بچی کھچی یادگار ایک میں ہی رہ گیا تھا اس لیے انجمن کی سرگردگی کا بار میرے ہی کندھوں پر ڈالا گیا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد ایسا معلوم ہوا کہ اب وہ فراخ دلی اور کشادگی باقی نہیں رہی ہے۔ بمبئی میں کل ہند انجمن کا دفتر قائم ہو چکا تھا اور ''نیا ادب'' کے سلسلۂ جدید کا اجرا ہو چکا تھا۔ نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی کشمکش بہت تیز ہو گئی تھی۔ مرکزی انجمن کی ہدایت کے مطابق انجمن کی رکنیت اب ادیبوں اور شاعروں تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں عالم، طالب علم، سیاسی رضا کار اور مزدور و کسان بھی شامل ہونے لگے جو اپنے آپ کو ترقی پسند خیالات و عقائد کا حامل سمجھتے۔ میری افتادِ طبع اس وقت تک کچھ ایسے سانچے میں ڈھل چکی تھی کہ میں زندگی اور ادب کے سلسلے میں اس تصور سے مطابقت نہیں کر پاتا تھا جس میں ضرورت سے زیادہ غلو، یک سرے پن اور منجمد نقطۂ خیال کی کارفرمائی ہوتی۔ پرانی مذہبی، اخلاقی

اور تہذیبی قدروں سے میں نے اپنا ناطہ اسی لیے توڑا تھا کہ میرے نزدیک ان میں ادعائیت اور انجماد پیدا ہو گیا تھا اور وہ زندگی کے نامیاتی اور حرکی تصور کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ترقی پسندی میرے نزدیک زندگی کے انھیں حرکی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا نام تھا۔ مگر میں آہستہ آہستہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ترقی پسندی کے دعوے دار ترقی پسندی کا بھی جامد اور محدود تصور رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں جس شدت سے کام لے رہے ہیں وہ اسی نوعیت کی ہے جو واعظوں اور محتسبوں کی خصوصیت ہوتی ہے اور جن سے بیزار ہو کر میں نے اس تحریک کے دامن میں پناہ لی تھی۔ اپنے مطالعے اور تجربے کی بنا پر شعر و ادب سے متعلق بھی میرا ذوق بہت سے دوستوں سے مختلف تھا۔ میں ان لوگوں سے بھی اپنے آپ کو متفق نہ پاتا جو محض غزل گوئی کو شاعری سمجھتے تھے یا اسلوب اور طرزِ بیان میں پرانے انداز سے ہٹ کر کسی نوع کی تازگی کو شبہے کی نظر سے دیکھتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے ان لوگوں کی بات بھی پسند نہیں آتی تھی جو غزل کو گردن زدنی سمجھتے یا قدیم شاعری کے تمام سرمایے کو جاگیردارانہ اور انحطاطی سماج کی یادگار سمجھ کر اس سے منہ پھیر لینا چاہتے تھے۔ محض غزل، محض نظم یا محض آزاد نظم پر اصرار کرنے اور اس پر اڑنے والوں کی ہمنوائی میں نہیں کر پاتا تھا اس لیے کہ میری سمجھ کے مطابق ان اسالیب اور ہیئتوں میں کوئی تضاد اور افتراق نہیں اور نہ یہ ہیئتیں اپنی جگہ پر اٹل اور جامد و ساکت ہیں۔ اسی طرح ذاتی شاعری، غمِ جاناں، غمِ دوراں، داخلیت اور خارجیت وغیرہ کی تقسیم اور ان کی طول طویل بحثیں بھی مجھے بے معنی نظر آتیں اور نہ یہ بات دل میں بیٹھتی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق کیوں دیا جائے۔ تخلیقی عمل ادیب کی شخصیت، افتادِ طبع، اس کی زندگی کے محسوسات و تجربات کی نوعیت اور اس کے انسانی و سماجی تعلقات کے ایک پیچ در پیچ سلسلے کا نام ہے۔ ان تمام مراحل سے فطری طور پر گزرنے کے بعد ہی شعر، نظم یا ادب پارہ اپنے اندر وہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے جو اسے جمالیاتی قدر اور فنی حسن عطا کرتی ہے۔ اس زمانے میں بھی میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ میری وہی نظمیں اور غزلیں کامیاب ہیں جہاں میرے شعور نے اوپر سے کسی قسم کی شرط عائد نہیں کی ہے۔ جہاں یہ شعور مجھے ڈراتا دھمکاتا اور ترقی پسندی کے کوڑے دکھاتا رہا ہے وہاں میری تحریریں بری طرح ناکام رہی ہیں یا اگر سو فیصدی ناکام نہیں رہیں تو ایک آنچ کی کسر ضرور رہ گئی ہے، مگر یہ دلچسپ واقعہ ہے کہ لوگ ایسی ہی نظموں کو سراہتے اور جو نظمیں ان کے نزدیک ذاتی، داخلی یا ان تجربوں سے متعلق ہوتیں جنھیں اس زمانے میں غمِ جاناں کہا جاتا تھا انھیں سن کر اس بات کا اظہار کرتے کہ ابھی آپ کا ذہن صاف نہیں ہے، ابھی آپ کے یہاں بہت سے جالے ہیں، اب ان چکروں سے نکل ہی جایئے تو اچھا

ہے۔

میں بڑے کشش و پنج میں مبتلا تھا۔ ان تحریروں کو اپنی اصلی تحریریں سمجھوں جو خود مجھے پسند آتی ہیں یا ان تحریروں کو جو ترقی پسندی کے رائج معیاروں پر پوری اترتی ہیں۔ بہت دنوں سوچتا رہا کہ شاید میں ہی غلطی پر ہوں۔ میرے ذاتی غموں نے شاید میری شخصیت کو بگاڑ دیا ہے یا ممکن ہے میر صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر گمراہ ہو گیا ہوں۔ یہ ذہنی کشمکش ابھی چل ہی رہی تھی کہ ترقی پسند ادیبوں کی انجمن کو ایک اور مرحلے سے دوچار ہونا پڑا۔ فروری 1949 میں کل ہند انجمن کی سیاسی پالیسی کے پیشِ نظر حکومت نے اسے غیر قانونی قرار دیا۔ علی گڑھ کی انجمن بھی اس کی آنچ سے محفوظ نہ رہ سکی کیونکہ اس کا الحاق بھی مرکزی انجمن سے ہو چکا تھا۔ میں چونکہ انجمن کا سکریٹری تھا اس لیے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت گرفتاری کا پروانہ سب سے پہلے میرے ہی نام جاری ہوا۔ میں نے اپنے آپ کو سپرنٹنڈنٹ جیل کے سپرد کر دیا۔ جیل میں دوسرے سیاسی کارکنوں کے ساتھ مجھے بھی رکھا گیا۔ جیل سے باہر جو کچھ ہو رہا تھا اس کی خبریں بھی کبھی کبھی مل جاتی تھیں۔ مجھے معلوم ہوا کہ بعض لوگوں نے اس ابتلا و آزمائش سے خوف کھا کر اور زمانے کی ہوا دیکھ کر ترقی پسندی سے اپنی برأت کا اظہار کر دیا ہے۔ ہر چند مجھے بھی انجمن کے سیاسی و ادبی نقطۂ نظر سے خاصا اختلاف تھا لیکن ان خبروں کا میرے اوپر ردِ عمل یہ ہوا کہ مجھے اس وقت اپنی ترقی پسندی پر اصرار کرنا چاہیے۔ اس وقت ترقی پسندی میرے لیے محض ایک ادبی سرگرمی کا نشان نہیں تھا بلکہ یہ میرے شخصی کردار کا امتحان تھا۔ میں نے اس موقع پر محض ادبی طرزِ فکر کی آڑ لے کر اس میدان سے فرار اختیار کرنے کو اپنے نفس اور اپنی انا کی توہین سمجھا۔ وہ لوگ جو بزدلی یا مصلحت کی بنا پر اس وقت کنّی کاٹ رہے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ترقی پسندوں کے عقائد سے انھیں شدید اختلاف ہے انھیں میں نے کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ اتفاق سے یہ وہ لوگ تھے جو اپنے اپنے طور پر ترقی پسندوں سے اختلاف رکھتے تھے، مگر بعض معاملات میں ان کے یہاں قدامت پسندی یا کسی ایک صنف یا اسلوب کے سلسلے میں جامد نقطۂ نظر کی کارفرمائی تھی۔ یہ وہ حضرات تھے جن کی نظر میں اپنی شاعری یا اپنی تحریروں کے علاوہ کچھ نہیں جچتا تھا۔ میرے مزاج کو ایسے لوگوں سے بھی زیادہ مناسبت نہیں تھی۔

چار مہینے قید و بند میں رہنے کے بعد جب میں رہا ہوا تو مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ ترقی پسندوں اور دوسرے سیاسی کارکنوں کے درمیان میری حیثیت ایک فاتح اور ہیرو کی تھی۔ لوگوں نے اپنے دل میں یہ سمجھا کہ چونکہ میں آزمائش میں پورا اترا ہوں اس لیے قدرتی طور پر میرے ذہنی جالے بھی ختم ہو چکے ہوں گے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ میرے ذہنی جالے برقرار تھے۔ اب یہاں

1

سے مجھے پھر ایک کشمکش کا سامنا کرنا پڑا۔ ترقی پسندوں سے میرا نباہ نہیں ہو سکتا ہے۔ ترقی پسندی کے جو لوگ کسی اور سبب سے مخالف بن گئے ہیں میں ان کی ہمنوائی نہیں کر سکتا۔ پھر کروں تو کیا کروں؟ ترقی پسندوں سے میرے اختلافات کی خبر پا کر بعض فرقہ پرست مذہبی جماعتوں کے افراد نے سمجھا کہ شاید یہ شخص اپنے پرانے عقائد سے تائب ہو گیا اس لیے اب یہ ہماری صفوں میں آ جائے گا، لیکن ان کی صفوں میں جانا تو میرے لیے اور بھی ناممکن تھا۔ وہیں جانا تھا تو ترقی پسندوں میں کیا برائی تھی۔ میں اگر اپنی انفرادی فکر کو تج کر کسی نقطۂ نظر سے مکمل وفاداری کی صلاحیت رکھتا تو میں اسی انجمن میں خوش رہ سکتا تھا جہاں اعزاز و اکرام کے سب دروازے میرے لیے وا تھے۔ یہ بکھیڑے تو خود میرے ہی پیدا کیے ہوئے تھے اس لیے کہ مجھ میں اپنے طور پر محسوس کرنے اور سوچنے سمجھنے کا جذبہ تھا اور میں اسی کو اپنی کائنات سمجھتا تھا۔ اس صلاحیت کی نفی کر کے کسی جماعت سے وابستگی میری شخصیت اور میرے وجود کی نفی تھی۔

میری ذہنی تنہائی کا دور پھر شروع ہوا۔ انجمن کی سکریٹری شپ سے میں نے استعفیٰ دے دیا۔ جلسوں میں اب بھی چلا جاتا تھا لیکن عام طور پر لوگوں سے کھنچا کھنچا رہنے لگا۔ شعر و شاعری بہت کم ہو گئی، کبھی کبھار ایک آدھ غزل ہو جاتی جس میں میری کی گونج سنائی دیتی۔ اس وقت چند لوگ ایسے بھی تھے جن سے دوستی اور تعلقات کی بنیاد صرف ادب پر نہیں تھی ان کے ساتھ اور بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔ مثلاً مختار الدین آرزو، قیوم قائد، شہاب جعفری، مولوی مشتاق حسین، رضی الدین احمد، جاوید کمال اور حنیف خاں ناشاد وغیرہ۔ یہ وہ لوگ تھے جو مجھ سے خلوص رکھتے تھے۔ ان کو میرے نئے شعروں کا انتظار رہتا تھا۔ یہ لوگ مجھ سے نئی نظمیں سننے کے لیے بے تاب رہتے لیکن نئی نظمیں کہاں سے نازل ہوتیں میں تو ایک اور ہی بھٹی میں تپ رہا تھا۔ زیادہ تر وقت سڑکوں پر بے معنی پھرنے، راتوں کو دیر تک جاگتے رہنے اور سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے میں گزر جاتا۔

تخلیقی زندگی کے اس تعطل کے علاوہ کچھ اور مسائل میری ذاتی زندگی میں آن کھڑے ہو گئے تھے۔ اس وقت میں ایم۔ اے کر چکا تھا۔ طالب علمی کی زندگی اپنی تمام صعوبتوں کے باوجود اس بے فکری اور لاابالی پن میں کٹی کہ بھول کر بھی یہ نہ سوچا تھا کہ آئندہ کیا کرنا ہے لیکن اب یہی میرے لیے سب سے اہم سوال بن گیا تھا۔ مجھے عارضی طور پر ''یونیورسٹی گزٹ'' کی ایڈیٹری مل گئی تھی لیکن یہ ملازمت اپنے اندر کچھ ایسی نزاکتیں رکھتی تھی جن سے عہدہ برآ ہونا میرے لیے آسان نہ تھا اور یہ رشتہ دن بدن ٹوٹتا نظر آتا تھا۔ دوستوں کے حلقے میں کچھ لوگوں کو ہم خیال پا کر انجمن میں مباحثوں

اور مذاکروں کا سلسلہ شروع کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے محدود نقطۂ نظر، چند ادیبوں کی اجارہ داری اور آمریت، ادب کے سلسلے میں غیر ادبی معیاروں کا اطلاق اور اس طرح کے رجحانات کے خلاف سب سے پہلے علی گڑھ کی انجمن سے آوازیں اٹھیں اور ان کو اٹھانے والے میں اور میرے چند احباب تھے۔ مقامی انجمن کے وہ اراکین جو ادیب کم اور ترقی پسند زیادہ تھے بلکہ بعض ادیب سرے سے نہ تھے محض ترقی پسندی کے دعوے دار تھے انھوں نے ہماری بڑی سخت مخالفت کی۔ مجھ کو اور میرے دوستوں کو گمراہ، انحطاط پرست، رجعت پسند اور اسی قبیل کے دوسرے خطابات سے نوازا گیا۔ یہ خطابات انجمن کے جلسوں کی تنگنائے سے نکل کر علی گڑھ کے گلی کوچوں، ڈرائنگ روموں اور ادب نواز خواتین کی محفل میں پہنچے۔ ہمارے بارے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں ہوئیں، بہت سی کہانیاں میرے اور میرے دوستوں کے نام سے منسوب ہوئیں اور اخلاقی و سماجی اعتبار سے کوئی عیب ایسا نہیں تھا جو ہمارے نامۂ اعمال میں درج نہ کیا گیا ہو۔ بعض حضرات نے یہ انکشاف کیا کہ ہماری ترقی پسندی ایک طالب علمانہ ترنگ اور جوانی کا اُبال تھی۔ اب چونکہ ہمیں ملازمت حاصل کر کے دنیاوی ترقی کا راستہ ہموار کرنا ہے اس لیے ہم نے اس سے انحراف کا ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔

مگر دنیاوی ترقی تو در کنار میری تو رہی سہی ملازمت بھی جاتی رہی۔ مارچ 1953 میں جب دہلی کے اندر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی آخری کانفرنس ہو رہی تھی اور ترقی پسند شعرا اسٹالن کی موت پر فی البدیہہ نظمیں کہہ رہے تھے میں ٹھیک اسی زمانے میں تلاشِ معاش کی خاطر مدراس اور بمبئی کی خاک چھان رہا تھا۔ مدراس اور بمبئی نے مجھے اپنے دامن میں پناہ نہیں دی اور کئی ماہ کی آوارہ گردی کے بعد میں وہاں سے خالی ہاتھ واپس آنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ مگر یہ کیوں کہوں کہ خالی ہاتھ آیا۔ میں اپنے ساتھ اس سفر سے کیا لایا تھا اس کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں ضلع مظفر پور کے ایک گاؤں بڑی کوٹھی میں اپنے دوست ناشاد کے ساتھ بے کاری اور بے روزگاری کے دن گزار رہا تھا۔

اس جگہ پہنچ کر مجھے یہ محسوس ہوا کہ میرے ذہن کے اندر پھر سے تخلیقی سوتے پھوٹ رہے ہیں اور پچھلے دنوں کے تلخ تجربات کے سبب جو گرد جم گئی تھی وہ دھل گئی ہے۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ طرح طرح کی دیکھی اَن دیکھی تصویریں میرے ذہن کے پردے پر ناچنے لگیں۔ میں ابھی کچھ لکھ نہیں پایا تھا کہ میرے شفیق استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ''تلاش گمشدہ'' کی تمہید باندھ کر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ مجھے اس مضمون کا ایک خط موصول ہوا کہ تمھارے لیے

علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں عارضی طور پر ایک جگہ نکل آئی ہے۔ فوراً آجاؤ۔ چنانچہ میں نے اسی علی گڑھ میں پھر سے قدم رکھا جہاں سے یہ سوچ کر رخصت ہوا تھا کہ شاید یہاں کی خاک اب مجھے قبول نہیں کرے گی۔

علی گڑھ کی ادبی فضا میں ہنوز کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میرے دوستوں کی پیشانی پر ابھی تک وہی لیبل چسپاں تھے جنھیں میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں بہت دنوں تک اس ماحول میں اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ ملازمت ملنے کی خوشی تھی لیکن اپنے اردگرد وہی گھٹن اور تنگی دیکھ کر دل کڑھتا تھا۔ کئی ماہ گزر جانے کے بعد ایک رات ایسا ہوا کہ سوتے میں میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے میری ایک نظم نے جگا دیا تھا جو ابھی لکھی نہیں گئی تھی۔ اس کا عنوان بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے قلم اور کاغذ سنبھالا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصرعے ڈھلے ڈھلائے چلے آرہے ہیں۔ نظم مکمل ہوئی تو عنوان بھی خود بخود طے ہو گیا یعنی ''نیا جنم''۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ میرا نیا جنم تھا ورنہ میں تو یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید اب ایک مصرعہ بھی نہ کہہ سکوں گا۔

اس نظم کے بعد پے بہ پے نظمیں ہونے لگیں۔ ان نظموں میں خود مجھے اپنی آواز نئی نئی اور اجنبی سی محسوس ہوتی۔ میرا لہجہ ایسا تھا جس سے میں خود پہلے آشنا نہیں تھا۔ یہ نظمیں داخلیت اور خارجیت کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی تھیں اس لیے ان میں ایک ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ان نظموں کا ''میں'' مختلف کرداروں کی صورت میں ڈھلتا ہوا معلوم ہوتا اور ایک ہی نظم میں کئی آوازوں کی گونج سنائی دیتی۔

یہ سلسلہ ابھی چل ہی رہا تھا اور میں اپنی ان نظموں کے نشے سے سرشار تھا کہ 1955 کی گرمیوں میں بعض احباب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اپنا مجموعۂ کلام مرتب کروں۔ میں نے اس وقت تک اس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔ مجھ سے تو باقاعدہ اپنی بیاض بھی کبھی نہیں رکھی گئی۔ جب بھی اپنی پچھلی نظمیں نقل کرنے بیٹھتا تو ان میں سے پچاس فیصدی ایسی نکلتیں جن کے بارے میں مجھے گمان ہوتا جیسے یہ میری ناجائز اولاد ہیں اور انھیں اپنے نام سے منسوب کرنے میں مجھے پس و پیش ہو رہا ہے۔ بقیہ پچاس فیصدی ایسی ہوتیں جو کسی نہ کسی جذباتی تعلق کی بنا پر مجھے عزیز ہوتیں لیکن انھیں دوبارہ دیکھتا تو وہ کئی اعتبار سے ناپختہ، ناتمام اور ناتراشیدہ نظر آتیں اور اسی الجھن میں بیاض خالی پڑی رہ جاتی۔ لیکن اس زمانے میں چونکہ یہ نظمیں نئی نئی وارد ہوئی تھیں اور مجھے پسند بھی تھیں میں نے انھیں ایک مجموعے کی صورت میں مرتب کر دیا مگر وہ تعداد میں اتنی نہ تھیں کہ ان سے کوئی کتاب بن سکتی اس لیے انھیں ناتمام اور ناتراشیدہ نظموں اور غزلوں میں سے کچھ چیزیں

انتخاب کر کے کتابی صورت دینی پڑی اور اس طرح ''کاغذی پیرہن'' کی اشاعت عمل میں آئی۔

میرا پہلا مجموعہ ''کاغذی پیرہن'' کتابت و طباعت کی خامیوں اور بہت سی ہلکی پھلکی نظموں اور غزلوں کی شمولیت کے باوجود ادبی حلقوں میں جس پذیرائی کا مستحق سمجھا گیا اس پر مجھے مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ عام تبصروں کے علاوہ کہ وہ بھی حوصلہ افزا تھے بعض معتبر اہلِ قلم مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ، ممتاز حسین اور نظیر صدیقی وغیرہ نے اس مجموعے پر مستقل مضامین لکھے اور میری شعری کاوشوں کی دل کھول کر داد دی۔ اس مجموعے کے ساتھ اسلوب احمد انصاری کا لکھا ہوا جو دیباچہ شامل کیا گیا تھا وہ خاص طور پر قابلِ توجہ تھا۔ دیباچہ نگاری کی عام روش سے ہٹ کر موصوف نے میرے مزاجِ شعری کا تجزیہ کرنے اور میری نظموں اور غزلوں کی منفرد خصوصیت واضح کرنے کے علاوہ میری کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کی طرف بھی اشارے کیے تھے۔ ان کوتاہیوں اور فروگزاشتوں کا تعلق اگر زبان و بیان کی چند ظاہری خصوصیات سے ہوتا تو شاید میں انھیں اسی وقت درست کر لیتا لیکن ان کا تعلق تخلیقی عمل اور شعری طریقِ کار سے تھا جن سے واقف ہونے کے بعد بھی ان پر قابو پانے میں دیر لگتی ہے۔ میں نے اس تنقید کا جو کچھ بھی اثر قبول کیا ہے وہ میری بعد کی نظموں میں ملے گا۔ اگر چہ یہ کہنا مشکل ہے کہ میں اس میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔

''کاغذی پیرہن'' کی اشاعت کو اب دس سال ہو گئے۔ اس دوران میری ذاتی زندگی میں بعض خوشگوار تبدیلیاں ہوئی ہیں جن کا اثر میری نظموں کے لہجے پر دیکھا جا سکتا ہے لیکن میری ذہنی تنہائی کسی نہ کسی صورت میں اب بھی برقرار ہے۔ اس کا تعلق اگر میری مادّی ضرورتوں اور جبلی خواہشوں سے ہوتا تو میں اب تک اس سے نجات حاصل کر چکا ہوتا لیکن اس کی جڑیں زیادہ گہری ہیں اور سماجی زندگی و انسانی اقدار کی وسعتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ میری نظر میں انسانی اقدار کا جو تصور ہے اور میں زندگی کا جو خواب دیکھا کرتا ہوں اس کا ٹکراؤ قدم قدم پر، میرے ماحول اور معاشرے سے ہوتا ہے اور میری روح غالبؔ کی طرح فریاد کرتی رہتی ہے کہ۔

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالبؔ
جو جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

اس لیے میری نظمیں اور غزلیں اب بھی داخلی اور خارجی حقیقت کے تصادم کی کہانیاں سناتی ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی

غزلیں

○

وہ دن کب کے بیت گئے جب دل سپنوں سے بہلتا تھا
گھر میں کوئی آئے کہ نہ آئے ایک دیا سا جلتا تھا

یاد آتی ہیں وہ شامیں جب رسم و راہ کسی سے تھی
ہم بے چین سے ہونے لگتے جوں جوں یہ دن ڈھلتا تھا

اُن گلیوں میں اب سنتے ہیں راتیں بھی سوجاتی ہیں
جن گلیوں میں ہم پھرتے تھے جہاں وہ چاند نکلتا تھا

وہ مانوس سلونے چہرے جانے اب کس حال میں ہیں
جن کو دیکھ کے خاک کا ذرّہ ذرّہ آنکھیں ملتا تھا

کوئی پرانا ساتھی بھی شاید ہی ہمیں پہچان سکے
ورنہ اک دن شہرِ وفا میں اپنا سکّہ چلتا تھا

شاید اپنا پیار ہی جھوٹا تھا ورنہ دستور یہ تھا
مٹی میں جو بیج بھی بویا جاتا تھا وہ پھلتا تھا

اب کے ایسی پت جھڑ آئی سوکھ گئی ہے ڈالی ڈالی
ایسے ڈھنگ سے کوئی پودا کب پوشاک بدلتا تھا

آج شبِ غم راس آئے تو اپنی بات بھی رہ جائے
اندھیارے کی کوکھ میں یوں تو پہلے سورج پلتا تھا

دنیا بھر کی رام کہانی کس کس ڈھنگ سے کہہ ڈالی
اپنی کہنے جب بیٹھے تو اک اک لفظ پگھلتا تھا

1956

○

نہیں اب کوئی خواب ایسا تری صورت جو دکھلائے
بچھڑ کر تجھ سے کس منزل پہ ہم تنہا چلے آئے

ابھی تک یاد آتے ہیں کچھ ایسے اجنبی چہرے
جنھیں دیکھے کوئی تو دیکھ کر تکتا ہی رہ جائے

یہ سچ ہے ایک زہرِ غم ہی آیا اپنے حصے میں
مگر یہ زہر پی کر بھی نہ ہم جینے سے باز آئے

اسی کے واسطے مت پوچھ کیا قیمت ادا کی ہے
مگر ہے کون جو ٹوٹے ہوئے اس دل کو اپنائے

اِسی امید پر زندہ ہے یہ ذوقِ سخن گوئی
کہ آنے والی دنیا شاید ان شعروں کو دُہرائے

ادھورے ہی سہی یہ نقش پھر بھی چھوڑ جاتے ہیں
کہ اس تصویر میں شاید کوئی اپناں نشاں پائے
(1956)

○

نشۂ مے کے سوا کتنے نشے اور بھی ہیں
کچھ بہانے مرے جینے کے لیے اور بھی ہیں

ٹھنڈی ٹھنڈی سی مگر غم سے ہے بھرپور ہوا
کئی بادل مری آنکھوں سے پرے اور بھی ہیں

عشقِ رسوا ترے ہر داغِ فروزاں کی قسم
میرے سینے میں کئی زخم ہرے اور بھی ہیں

زندگی آج تلک جیسے گزاری ہے نہ پوچھ
زندگی ہے تو ابھی کتنے مزے اور بھی ہیں

ہجر تو ہجر تھا اب دیکھیے کیا بیتے گی
اس کی قربت میں کئی درد نئے اور بھی ہیں

رات تو خیر کسی طرح سے کٹ جائے گی
رات کے بعد کئی کوس کڑے اور بھی ہیں

غمِ دوراں مرے بازوئے شکستہ سے نہ کھیل
مشغلے میری جوانی کے لیے اور بھی ہیں

وادیٔ غم میں مجھے دیر تلک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

(1956)

O

ہنگامۂ حیات سے جاں بر نہ ہوسکا
یہ دل عجیب دل ہے کہ پتھر نہ ہوسکا

میرے لہو بھی پی کے نہ دنیا جواں ہوئی
قیمت مرے جنوں کی مرا سر نہ ہوسکا

تیری گلی سے چھٹ کے نہ جائے اماں ملی
اب کے تو میرا گھر بھی مرا گھر نہ ہوسکا

تیرے نہ ہوسکے تو کسی کے نہ ہوسکے
یہ کاروبارِ شوق مکرّر نہ ہوسکا

یوں جی بہل گیا ہے تری یاد سے مگر
تیرا خیال تیرے برابر نہ ہوسکا

گزری جو شب تو بجھ گئے اپنے چراغ بھی
آئی سحر تو پھر کوئی رہبر نہ ہوسکا

(1956)

O

میرے شعروں سے بھی بڑھ کر تری صورت ہے حسیں
کس طرح تجھ کو میں اپناؤں مری زہرہ جبیں

تو مجھے چاہے نہ چاہے یہ ترے بس میں تو ہے
اور میں تجھ کو نہ چاہوں یہ مرے بس میں تو نہیں

میرے چہرے پہ بہت کم ہے مرے دل کی جلن
کاش میں اور بھی ہوسکتا ملول و غمگیں

دور ہی سے کبھی جھنکار سُنا دے اپنی
وہ اندھیرا ہے کہ اب میں ہی نہ کھو جاؤں کہیں

جلد آجا کہ کہیں بیت نہ جائے موسم
جلد آجا کہ ابھی جاگ رہی ہے یہ زمیں

ایک بس اہلِ وفا کو ہی نہیں راس آتے
جانے کس طرح کے ہیں شہرِ وفا کے آئیں

زہرِ غم پی کے مرے ہونٹوں پہ جو رنگ بھی آئے
میری آواز مگر پھر بھی ہے اب تک شیریں

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون ہے؟ میں ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں!!!

(1956)

○

تجھ سے بچھڑ کے دل کی صدا کو بکو گئی
لے آج دردِ عشق کی بھی آبرو گئی

وہ رت جگے رہے نہ وہ نیندوں کے قافلے
وہ شامِ میکدہ، وہ شبِ مشک بو گئی

دنیا عجب جگہ ہے کہیں جی بہل نہ جائے
تجھ سے بھی دور آج تری آرزو گئی

اے کاش میں نہ سازِ حقیقت کو چھیڑتا
وہ دلنواز اک خلش جستجو گئی

کتنی عجیب شے تھی مگر خواہشِ وصال
جو تیری ہو کے بھی نہ ترے روبرو گئی

روٹھی تو خوب روٹھی رہی ہم سے فصلِ گل
آئی تو پھر نچوڑ کے دل کا لہو گئی

سینہ لہو لہان تھا ہر ہر کلی کا آج
بادِ صبا چمن سے بہت سرخرو گئی

(1956)

○

ابھی جی بھر کے پی لو پھر نہ یہ موسم بدل جائے
نہ جانے یہ پری پھر کون سے شیشے میں ڈھل جائے

بہت سمجھا بجھا کر راہ پر لائے ہیں اس دل کو
کہیں ظالم نہ پھر کوئی نرالی چال چل جائے

دعاؤں سے ملے بھی کچھ تو شاید موت ملتی ہے
یہ وہ جادو نہیں جو زندگی کے سر پہ چل جائے

جنوں لے کر چلا ہے مجھ کو پھر کوئے حریفاں میں
جو باقی رہ گیا ہے اب وہ کانٹا بھی نکل جائے

وہ رسوا ہی سہی لیکن خبر لیتے رہو اس کی
دل آخر دل ہے کیا جانے کہاں جاکر بہل جائے

نہ جانے کیوں بھروسا ہے ابھی پائے شکستہ پر
گلی تک تیری جاتے جاتے شاید یہ سنبھل جائے

کوئی زنجیرِ در کھڑکی، نہ آوازِ صبا آئی
کوئی تاریک سایہ پھر نہ کلیوں کو مسل جائے
(1957)

O

شراب ڈھلتی ہے شیشے میں، پھول کھلتے ہیں
چلے بھی آؤ کہ اب دونوں وقت ملتے ہیں

جو ہو سکے تو گلے مل کے رو لے اے غمخوار
کہ آنسوؤں ہی سے دامن کے چاک سلتے ہیں

یہ اور بات کہانی سی کوئی بن جائے
حریمِ ناز کے پردے ہوا سے ہلتے ہیں

مرے لہو سے معطّر ترے لبوں کے گلاب
تری وفا سے کنول میرے دل کے کھلتے ہیں

دھڑک رہا ہے مسرّت سے کائنات کا دل
کبھی کے بچھڑے ہوئے دوست آج ملتے ہیں
(1957)

○

زندگی بھی مرے نالوں کی شناسا نکلی
دل جو ٹوٹا تو مرے گھر میں کوئی شمع جلی

آج رستا ہے درو بام سے یہ کس کا لہو
میری گم گشتہ تمنا تری آہٹ تو ملی

کون آیا کہ سرِ شام لٹا شہرِ خیال
سسکیاں بھرتی ہے راتوں کو اب ایک ایک گلی

یادِ ایّام اندھیروں میں مہکتے تھے گلاب
اب اجالوں میں بھی کھلتی نہیں خوابوں کی کلی

دیکھتے دیکھتے مرجھا گئے کمسن پودے
وقت کی دھوپ سے اس باغ کی ہر شاخ جلی

تیر کی طرح سے ایک ایک کرن چبھتی ہے
یہ مری صبح کہ ہے ہجر کی گودوں میں پلی

جی میں کیا آئی کہ میں بھول کے سچ کہہ بیٹھا
ایک اک لفظ پہ اُس بزم میں تلوار چلی

(1957)

○

بہت دنوں میں نے کنجِ خلوت میں اپنی آواز ہی سنی ہے
مگر مری بانسری فضاؤں سے آج کچھ اور کہہ رہی ہے

بس ایک شعلے کی سرکشی سے چراغ سینے کے جل اٹھے ہیں
کیا ہے دامن کو چاک میں نے تو آج ہر سمت روشنی ہے

نہ پوچھ مستوں کو زہرِ غم پی کے آج کتنا سرور آیا
نہ دو سے وانگبیں کے ساغر کہ اب مری پیاس بجھ چکی ہے

کسی نگہ کا سلام لیتے تو آج کیوں سوگوار ہوتے
وہ کچھ پری رو کہ جن کے چہروں کی ساری تحریر مٹ چلی ہے

چلو کہ اب غم کی وادیوں میں طلوعِ مہتاب کا سماں ہے
جہاں جہاں میرے اشک برسے وہاں کی مٹی سنور گئی ہے

عدو کو کب حوصلہ تھا اتنا تری محبت کی مار سہتا
ہمیں نے کی ہے یہ پیش دستی، ہمیں نے کچھ چھیڑ چھاڑ کی ہے

لگے رہو بازوؤں سے میرے کہ یہ گھڑی پھر بھی ہے غنیمت
ہوا کے جھونکے یہ کہہ رہے ہیں کہ رات آدھی گزر چکی ہے
(1957)

O

آج ڈوبا ہوا خوشبو میں ہے پیراہنِ جاں
اے صبا کس نے یہ پوچھا ہے مرا نام و نشاں

اس کڑی دھوپ میں اک ان کو ہی سایہ نہ ملا
تجھ پہ اے گیسوئے ایام ہوئے جو قرباں

زہرِ غم پی کے بڑھی اور بھی جینے کی ہوس
زندگی بھر نہ کبھی موت پہ لائے ایماں

دیکھ صنّاع! مرے رنگِ شکستہ پہ نہ جا
اس سے بہتر نہیں تصویر کا کوئی عنواں

شمع کیا جانے کہ کب ہوتی ہے ہجراں کی سحر
رات کٹ جاتی ہے کٹتا نہیں یہ کوہِ گراں

پھر مرے شہرِ طرب پر نہ کوئی آنچ آئے
آج کیوں خیمۂ افلاک سے اٹھتا ہے دھواں

لاکھ سادہ سہی یہ تیری جبیں کی تحریر
اس سے اکثر مرے افکار کو ملتی ہے زباں
(1958)

O

ہر خار و خس سے وضع نبھاتے رہے ہیں ہم
یوں زندگی کی آگ جلاتے رہے ہیں ہم

شیرینیوں کو زہر کے داموں میں بیچ کر
نغمے حیاتِ نو کے سناتے رہے ہیں ہم

اس کی تو داد دے گا ہمارا کوئی رقیب
جب سنگ اٹھا تو سر بھی اٹھاتے رہے ہیں ہم

تا دِل پہ زخم اور نہ کوئی نیا لگے
اپنوں سے اپنا حال چھپاتے رہے ہیں ہم

تیرے لیے ہی رات بھر اے مہرِ زر نگار
تاریکیوں کے ناز اٹھاتے رہے ہیں ہم

اب کوئی تازہ پھول کھلا خاکِ پائمال!
اپنا لہو زمیں کو پلاتے رہے ہیں ہم
(1958)

O

سوئی ہے کلی دل کی اس کو بھی جگا جانا
اس راہ سے بھی ہوکر اے بادِ صبا جانا

ہم بھولتے جاتے ہیں اُس چہرۂ زیبا کو
اے خواب ذرا اس کی صورت تو دکھا جانا

جب موسمِ گل آئے اے نکہتِ آوارہ
آکر درِ زنداں کی زنجیر ہلا جانا

پھر ہاتھ چھڑاتی ہے مجھ سے مری تنہائی
پھر دل کے سنبھلنے کے انداز بتا جانا

کس ناز سے پالا ہے ہم نے غمِ ہجراں کو
اس غم کو ذرا آکر سینے سے لگا جانا

اوروں کے لیے یوں تو اک سنگِ گراں ہم ہیں
ہاں تم جو کبھی چاہو مٹی میں ملا جانا

آنکھوں سے بھی اب دل کی روداد نہیں کہتے
اب ہم سے کوئی سیکھے ہر بھید چھپا جانا

اپنے ہی خرابے میں ہم عمر گزاریں گے
جب تم کو ملے فرصت یہ گھر بھی بسا جانا
(1958)

O

کوئی تم جیسا تھا ، ایسا ہی کوئی چہرا تھا
یاد آتا ہے کہ اک خواب کبھی دیکھا تھا

رات جب دیر تلک چاند نہیں نکلا تھا
میری ہی طرح سے سایہ بھی مرا تنہا تھا

جانے کیا سوچ کے تم نے مرا دل پھیر دیا
میرے پیارے اسی مٹی میں مرا سونا تھا

وہ بھی کمبخت زمانے کی ہوا لے کے گئی
میری آنکھوں میں مری مے کا جو اک قطرہ تھا

تو نہ جاگا مگر اے دل ترے دروازے پر
ایسا لگتا ہے کوئی پچھلے پہر آیا تھا

تیری دیوار کا سایہ نہ خفا ہو مجھ سے
راہ چلتے یونہی کچھ دیر کو آ بیٹھا تھا

اے شبِ غم مجھے خوابوں میں سہی دکھلادے
میرا سورج تری وادی میں کہیں ڈوبا تھا

اک مری آنکھ ہی شبنم سے شرابور رہی
صبح کو ورنہ ہر اک پھول کا منھ سوکھا تھا

تم ذرا تھام لو آکر کبھی پیمانۂ جاں
دیکھو دیکھو مرے ہاتھوں سے ابھی چھوٹا تھا

(1959)

○

اس در پہ بھی لگتا نہیں جی دیکھیے کیا ہو
ہے اب کے عجب دل کی لگی دیکھیے کیا ہو

دیکھا تھا سرِ شام کہ رس آ تو چلا تھا
چٹکی نہ مگر دل کی کلی دیکھیے کیا ہو

کیا غیر کی پہچان کہ اب شہرِ جنوں میں
ہوتی نہیں وہ سنگ زنی دیکھیے کیا ہو

آ آ کے گزر جائے ہے ہر موجۂ پُرخوں
ہے یاں وہی شوریدہ سری دیکھیے کیا ہو

چمکے ہیں ابھی چند ستارے سرِ مژگاں
باقی ہے بہت رات ابھی دیکھیے کیا ہو

جلتا نہیں اب کوئی دیا دل کے نگر میں
ویران ہے ایک ایک گلی دیکھیے کیا ہو

اب دور کہیں چل کے ذرا اپنے کو ڈھونڈیں
اپنے ہی سے لگتے ہیں سبھی دیکھیے کیا ہو
(1959)

○

اب کے آئی جو مری رہ میں تو پامال رہی
گھات میں یوں تو بہت گردِ مہ و سال رہی

خاک ہوکر ہی رہے ہم درِ میخانہ کی
سرخی سے ہی سرِ نامۂ اعمال رہی

نہ ہوا یہ کہ تہِ دام کبھی سو رہتے
زندگی اپنی تو رسوائے پر و بال رہی

قفسِ رنگ سے نکلی تو ٹھکانہ نہ ملا
بوئے گل جب سے اُڑی اور بھی بے حال رہی

کاسۂ چشم کو دے دو کوئی آنسو، کوئی خواب
ورنہ سمجھوں گا کہ دنیا مری کنگال رہی

یوں کبھی ہم کو نہ تھا دعویٰ شمشیر زنی
ہاں حریفوں سے مگر پرسشِ احوال رہی
(1959)

○

وہ حسن جس کو دیکھ کے کچھ بھی کہا نہ جائے
دل کی لگی اسی سے کہے بن رہا نہ جائے

کیا جانے کب سے دل میں ہے اپنے بسا ہوا
ایسا نگر کہ جس میں کوئی راستا نہ جائے

دامن رفو کرو کہ بہت تیز ہے ہوا
دل کا چراغ پھر کوئی آکر بجھا نہ جائے

نازک بہت ہے رشتۂ دل تیز مت چلو
دیکھو تمھارے ہاتھ سے یہ سلسلا نہ جائے

ہے کوئی کھیل جان گنوانے کا حوصلہ
خیر اب جو آگیا ہے تو یہ مرحلا نہ جائے

اک وہ بھی ہیں کہ غیر کا بُنتے ہیں جو کفن
اک ہم کہ اپنا چاک گریباں سیا نہ جائے

(1960)

O

ہے عجیب چیز مئے جنوں، کبھی دل کی پیاس نہیں بجھی
مگر اب ملا کے تو دیکھ لوں ذرا ایک قطرۂ آگہی

مری خامشی، مری بے حسی، یہی میرا رازِ فسردگی
کبھی سو گیا ہوں تو جاگ اٹھی ہے یہ دل کی چوٹ دبی دبی

ہے یہ کیسی صحبتِ میکشاں کہ ہر اک جام لہو لہو
یہی دوستی ہے تو اے خدا مجھے راس آئے نہ دوستی

ہے ملول مجھ سے دعائے موت کہ ساتھ اس کا نہ دے سکا
مرے راستے میں جو آگئی یہی زندگی، یہی زندگی

ذرا آ کے سامنے بیٹھ جا، مری چشمِ تر کے قریب آ
مرے آئینے میں بھی دیکھ لے کبھی اپنی زلف کی برہمی

یہی ساتھ ساتھ مرے رہا، میں اسی کا پا نہ سکا پتا
کبھی ہر قدم پہ مجھے ملا، یہی آدمی، یہی آدمی

مرے ساتھ ساتھ چلے تھے سب، مرا ساتھ کوئی نہ دے سکا
مرے ہم سفر، مرے ہم نظر، مری خود سری، مری سرکشی

مری سمت اور بھی ساقیا! وہ جو بوند بوند میں زہر تھا
جسے اور کوئی نہ پی سکا وہ شراب میرے ہی منھ لگی

میں شہید ظلمتِ شب سہی، مری خاک کو یہی جستجو
کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی
(1960)

○

پینا نہیں حرام، ہے زہرِ وفا کی شرط
آؤ اٹھا دیں آج مئے جاں فزاں کی شرط

شوریدگیٔ سر کے لیے سنگِ در کی قید
زنجیرِ غم کے واسطے زلفِ دوتا کی شرط

ہو دوپہر کی دھوپ تو پلکوں کے سائباں
راتیں گزارنی ہوں تو کالی بلا کی شرط

یہ کیا ضرور، ہو مژۂ عشق خوں فشاں
کیوں دستِ ناز کے لیے رنگِ حنا کی شرط

ہر دل فگار کے لیے کیوں چاک پیرہن
ہر دلنواز کے لیے بندِ قبا کی شرط

کیا فرض ہے کہ ہم بھی بنیں قیسِ عامری
راہِ جنوں میں کیوں ہو کسی نقشِ پا کی شرط

کیوں دل کے توڑنے کو کہیں رسمِ دلبری
کیوں ہو کسی سے وعدۂ صبر آزما کی شرط

کیوں ہو کسی کو کوچۂ قاتل کی جستجو
کیوں امتحاں کے واسطے تیغِ جفا کی شرط

کیوں زندگی کو جبرِ مسلسل کا نام دیں
کیوں آرزوئے موت کو دستِ دعا کی شرط

کیوں ہر گھڑی زباں پہ ہو جرم و سزا کا ذکر
کیوں ہر عمل کی فکر میں خوفِ خدا کی شرط

ہم نے خود اپنے آپ زمانے کی سیر کی
ہم نے قبول کی نہ کسی رہنما کی شرط

(1961)

○

خود چلے آؤ یہاں یا کہ صدا دو ہم کو
ہم گنہ گار تمھارے ہیں دعا دو ہم کو

کیا کریں ہم سے یہ ہوتی نہیں دنیا داری
ہم جو دنیا کے نہیں ہیں تو مٹا دو ہم کو

ہم تمھارے ہیں، تمھارے ہی قریب آ بیٹھے
ہوں جو گستاخ تو محفل سے اٹھا دو ہم کو

دامنِ قیس سہی، دامنِ یوسف نہ سہی
اب تو یہ چاک ہے جو چاہے سزا دو ہم کو

اپنی ہی راکھ میں یہ آگ نہ کجلا جائے
اب لگائی ہے تو آنچل کی ہوا دو ہم کو

یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا
پوچھ کر گردشِ دوراں سے بتا دو ہم کو

یا ہمیں قید کرو مجلسِ تنہائی میں
یا اُسی دشمنِ جانی سے ملا دو ہم کو

جن کو آنکھوں سے لگایا تو ہمیں چھوڑ گئے
انھیں چہروں، انھیں خوابوں کا پتا دو ہم کو
(1961)

O

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر! ذرا پکار مجھے

میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن! مری دہلیز پر اُتار مجھے

اُبلتے دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبحِ زرنگار مجھے

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آکے سنگسار مجھے

وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے
(1961)

O

وہ رنگِ رُخ، وہ آتشِ خوں کون لے گیا
اے دل ترا وہ رقصِ جنوں کون لے گیا

زنجیر آنسوؤں کی کہاں ٹوٹ کر گری
وہ انتہائے غم کا سکوں کون لے گیا

دردِ نہاں کے چھین لیے کس نے آئینے
نوکِ مژہ سے قطرۂ خوں کون لے گیا

جو مجھ سے بولتی تھیں وہ راتیں کہاں گئیں
جو جاگتا تھا سوزِ دروں کون لے گیا

کس موڑ پر بچھڑ گئے خوابوں کے قافلے
وہ منزلِ طرب کا فسوں کون لے گیا

جو شمع اتنی رات جلی کیوں وہ بجھ گئی
جو شوق ہو چلا تھا فزوں کون لے گیا

(1961ء)

○

ایک سی بے رنگ صبحیں، ایک سی بے کیف شام
لے رہی ہے زندگی مجھ سے یہ کب کا انتقام

کون سی منزل میں ہوں اب کچھ بھی یاد آتا نہیں
اپنی تنہائی سے اکثر پوچھتا ہوں اپنا نام

اپنے سینے میں لیے پھرتے ہیں اک شمعِ خیال
جو پجاری ہیں ترے، ہے تیرگی ان پر حرام

مے نہیں ہے آج تو زہرِ حوادث ہی سہی
شکر ہے خالی نہیں رہتا کبھی مستوں کا جام

عمر بھر مصروف ہیں مرنے کی تیاری میں لوگ
ایک دن کے جشن کا ہوتا ہے کتنا اہتمام

پرسشِ احوال کو آئے ہو مرگِ دل کے بعد
جاؤ بھی، تم سے نہیں مجھ کو رہا اب کوئی کام

ہم نہیں قائل کسی مجنوں، کسی فرہاد کے
یہ نمازِ عشق ہے اس کا نہیں کوئی امام

تجھ کو ٹھوکر مار کر بیٹھے ہیں فرشِ خاک پر
کر غمِ دنیا ہم ایسے سرکشوں کا احترام
(1962)

O

ہم وہ ہیں باز نہ آئیں گے ابھی جینے سے
اپنا احوال چھپاتے ہیں جو آئینے سے

لوگ کیا ڈھونڈ رہے ہیں مری پیشانی پر
رنگ آتا ہے یہاں اپنا لہو پینے سے

ہاتھ جو مجھ سے چھڑاتی ہے وہی پرچھائیں
لگ کے سو جاتی ہے راتوں کو مرے سینے سے

کھڑکیاں جاگتی آنکھوں کی کھلی رہنے دو
دل میں مہتاب اترتا ہے اسی زینے سے
(1962)

O

ترتیب دے رہا ہوں دیوانِ عاشقی کو
لکھ لکھ کے کاٹتا ہوں عنوانِ زندگی کو

تو ساتھ چل سکے گی اے گردشِ زمانہ؟
اب اک نئے سفر پر جانا ہے آدمی کو

گمراہ ہو کے میں نے ڈھونڈی ہیں اپنی راہیں
ایماں دعائیں دیتا ہے میری کافری کو

گھر سے نکل پڑے ہیں اب کس کی جستجو میں
پہچانتے نہیں ہیں ہم آج سے کسی کو

در پے رہا ہو جن کے انبوہِ کم سواداں
وہ خوب جانتے ہیں آشوبِ آگہی کو

کیا دیکھ کر کروگے یہ دامنِ دریدہ
ہے دیکھنا تو دیکھو دل کی شگفتگی کو

برسوں پھرے ہیں ہم بھی مثلِ غزالِ وحشی
پہلو میں لے کے تیری خوشبوئے دلبری کو

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں ایک ایک پنکھڑی کو

کل بٹ رہا تھا ان کی محفل میں آبِ حیواں
ہم لوٹ آئے لے کر ناموسِ تشنگی کو

ہے آج کون سا دن، آنکھوں کو کیا ہوا ہے؟
آواز دے رہی ہیں ہر سمت روشنی کو

(1963)

O

اے ناصحو نہ اور کوئی گفتگو کرو
گر ہوسکے تو چاک گریباں رفو کرو

ہوتی نہیں ہے یوں ہی ادا یہ نمازِ عشق
یاں شرط ہے کہ اپنے لہو سے وضو کرو

پھر جس طرح بھی چاہو کرو ہم پہ تبصرہ
پہلے ہماری طرح سے جینے کی خو کرو

پھر کوئی لے گیا ہے چراغوں کی روشنی
تا صبح آج اپنے جگر کو لہو کرو

وہ تو نہیں یہ اس کا ہی ہم شکل ہے کوئی
اب اس کی چل کے اور کہیں جستجو کرو

آج اس حسیں سے مل کے عجب کیفیت میں ہوں
کوئی رقیب ہو تو مرے روبرو کرو
(1963)

O

میں ترے غم میں اب نہیں ناشاد
دے مری جاں مجھے مبارک باد

میرے دشمن نہ مجھ کو بھول سکے
ورنہ رکھتا ہے کون کس کو یاد

ہیں سبھی آدمی تو پھر یہ کیوں
آدمی کو ہے آدمی سے عناد

عشق اور زندگی کی مانگے بھیک؟
کوئی ایسی ہی پڑگئی اُفتاد

ہم زمانے سے صلح تو کرلیں
اور نہ جائے جو اس کی خوئے فساد؟

اور کیا دیں خراجِ کشتِ امید
فصل کی فصل ہوگئی برباد

حاصلِ عمر کیا ہے تنہائی
کیا چمن، کیسا خانۂ صیّاد
(1964)

○

تو بھی اب چھوڑ دے ساتھ اے غمِ دنیا میرا
میری بستی میں نہیں کوئی شناسا میرا

شب غم پار لگا دے یہ سفینا میرا
صبح ہوگی تو اتر جائے گا دریا میرا

مجھ کو معلوم نہیں نام ہے اب کیا میرا
ڈھونڈنے والے مجھے! چھوڑ دے پیچھا میرا

میں نے دیکھی نہیں برسوں سے خود اپنی صورت
میرے آئینے سے روٹھا ہے سراپا میرا

تو بھی خوابوں میں ملی، میں بھی دھندلکوں میں تجھے
زندگی! دیکھ کبھی غور سے چہرا میرا

گھر سے نکلا ہوں تو اب دور کہیں جانے دے
روک اے گردشِ ایام نہ رستا میرا

دو قدم دوڑ کے آوازِ جرس بیٹھ گئی
چل پڑا میں تو کہیں پاؤں نہ ٹھہرا میرا

میرے دامن میں رہی خاکِ غریب الوطنی
رہ گیا دیکھ کے منھ دامنِ صحرا میرا

(1964)

○

کہوں یہ کیسے کہ جینے کا حوصلہ دیتے
مگر یہی کہ مجھے غم کوئی نیا دیتے

شب گذشتہ بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تجھے صدا دیتے

کئی زمانے اسی پیچ و تاب میں گزرے
کہ آسماں کو ترے پاؤں پر جھکا دیتے

یہ کہیے لوحِ جبیں پر ہے داغِ رسوائی
زمانے والے ہمیں خاک میں ملا دیتے

ہوئی تھی ہم سے جو لغزش تو تھام لینا تھا
ہمارے ہاتھ تمھیں عمر بھر دعا دیتے

بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمھیں بھلا دیتے

کوئی ہو لمحۂ فرصت کہ بیٹھ کر ہم بھی
ذرا عروسِ تمنا کو آئینہ دیتے

ملا ہے جرمِ وفا پر عذابِ مجبوری
ہم اپنے آپ کو اس سے کڑی سزا دیتے

زباں پہ کس لیے یہ حرفِ ناگوار آتا
ہمارے زخم ہمارا اگر پتا دیتے

ذرا سی دیر ٹھہرتی جو گردشِ ایّام
اسے شبابِ گریزاں کا واسطا دیتے

(1964)

O

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

سونا ہوں کرید کر تو دیکھو
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں

لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت!
ٹوٹا ہوا تیرا آئینا ہوں

یوں ربط تو ہے نشاط سے بھی
در اصل میں غم سے آشنا ہوں

صحبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر
کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں

دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا
ہر ایک کے حق میں میں دُعا ہوں

کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں
میں زہرِ حیات پی چکا ہوں

تقدیرِ جنوں پہ چپ رہا میں
تعبیرِ جنوں پہ رو رہا ہوں

ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

(1964)

O

یہ الگ بات کہ ہر سمت سے پتھر آیا
سر بلندی کا بھی الزام مرے سر آیا

زندگی چھوڑنے آئی مجھے دروازے تک
رات کے پچھلے پہر میں جو کبھی گھر آیا

بس دعا ہے کہ الٰہی یہ کوئی خواب نہ ہو
کوئی سایہ مرے سایے کے برابر آیا

بار ہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں
بار ہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا

کیا کہیں اب تو یہ عادت نہیں جاتی ہم سے
جھوٹ بھی بولے تو سچ بن کے زباں پر آیا

میں نہیں حق میں زمانے کو برا کہنے کے
اب کے میں کھا کے زمانے کی جو ٹھوکر آیا

سرخی مے بھی ٹھہرتی نہیں ہر چہرے پر
بوالہوس بھی اسی مے خانے سے ہو کر آیا

پڑھ مرے ہاتھ پہ اب کلمۂ حق اے واعظ
دار سے ہوتا ہوا میں سرِ منبر آیا
(1965)

O

رخصت ہوئے یہ کہہ کر اس شوخ کی گلی سے
اب پھر گلے ملیں گے ہم جا کے زندگی سے

ہے اپنی یہ طبیعت ہم کو معاف رکھنا
احوالِ رنج و غم ہم کہتے نہیں کسی سے

کس کس سے ہم چھپائیں صد چاک پیرہن کو
عالم یہ ہے کہ اب تو ڈرتے ہیں روشنی سے

ہم جانتے ہیں کیا ہیں یہ مردمانِ دنیا
یوں دیکھنے میں وہ بھی لگتے ہیں آدمی سے

کیوں اختیار کیجیے یہ عیب طول گوئی
مطلب نکل رہا ہو جب اپنی خامشی سے

آنکھوں کے سامنے سے اب جامِ مے ہٹالو
شرمندہ ہوں گے ہم بھی اظہارِ تشنگی سے

ہے ایک وضع یہ بھی جس کو نبھا رہا ہوں
بس اور کچھ نہ سمجھو تم میری سادگی سے
(1965)

O

دل کی رہ جائے نہ دل میں یہ کہانی کہہ لو
چاہے دو حرف لکھو چاہے زبانی کہہ لو

میں نے مرنے کی دعا مانگی وہ پوری نہ ہوئی
بس اسی کو مرے جینے کی نشانی کہہ لو

صرصرِ وقت اڑا لے گئی روداد حیات
وہی اوراق جنھیں عہدِ جوانی کہہ لو

تم سے کہنے کی نہ تھی بات مگر کہہ بیٹھا
اب اسے میری طبیعت کی روانی کہہ لو

وہی اک قصّہ زمانے کو مرا یاد رہا
وہی اک بات جسے آج پرانی کہہ لو

جب نہیں شاخِ چمن پر تو مرا نام ہی کیا
برگِ آوارہ کہو برگِ خزانی کہہ لو

ہم پہ جو گزری ہے بس اس کو رقم کرتے ہیں
آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو
(1965)

O

اتنی لمبی ہے کہانی کہیں دم ٹوٹ نہ جائے
حالِ دل اور لکھیں گے یہ قلم ٹوٹ نہ جائے

ہم چھپاتے ہیں پریشانیٔ خاطر اُن سے
طبعِ نازک پہ بھی یہ کوہِ الم ٹوٹ نہ جائے

ہم نے خود جس کو تراشا ہے بڑی محنت سے
اب ہمیں سے یہ خیالوں کا صنم ٹوٹ نہ جائے

اب ٹھہرتا نہیں اس گھر میں کوئی اور چراغ
قطرہ قطرہ ترا اے دیدۂ نم ٹوٹ نہ جائے

کسی قیمت کسی بازار میں ملتا نہیں دل
لو سنبھالو کہ یہ پیمانۂ جم ٹوٹ نہ جائے

اور آہستہ چلو رہگزرِ ہستی میں
کہیں یہ سلسلۂ نقشِ قدم ٹوٹ نہ جائے
(1965)

O

تجھ پہ ہے سب کی عنایت، ہیں تجھی پر سب عذاب
تو نے آخر کیا کیا ہے اے دلِ خانہ خراب

اپنے ذِمّے اب نہیں ہے آخرت کا کوئی قرض
زندگی لیتی رہی ہے رات دن ہم سے حساب

جس کے حصے کی ہے جو آتی ہے اس کے جام میں
روز و شب مینائے گردوں سے ٹپکتی ہے شراب

ہم سفر بن کر رہے ہیں گردشِ ایام کے
ہم سے پوچھو کس کو کہتے ہیں طلوعِ آفتاب

ہوسکا تو پھر سنائیں گے تمھیں یہ سرگزشت
ہے ابھی تو داستانِ عشق کا پہلا ہی باب

آج تک اس شخص سے ملنے کی حسرت ہی رہی
تشنہ لب ہو اور پھر پہچان لے رنگِ سراب

دیکھ دنیا اب ہمیں کچھ دیر تنہا چھوڑ دے
ایسے عالم میں کہ جب ہم پر اترتی ہو کتاب

یوں تو ہم صورت ترے کچھ اور بھی چہرے ملے
پھر بھی ہم ڈھونڈا کیے ہیں آج تک تیرا جواب

گود میں بھر کر اٹھالی جتنی مٹی مل سکی
کوچۂ جاناں سے ہم لوٹے ہیں ہو کر کامیاب

(1965)

○

بس کہ پابندیٔ آئینِ وفا ہم سے ہوئی
یہ اگر کوئی خطا ہے تو خطا ہم سے ہوئی

زندگی تیرے لیے سب کو خفا ہم نے کیا
اپنی قسمت ہے کہ اب تو بھی خفا ہم سے ہوئی

رات بھر چین سے سونے نہیں دیتی ہم کو
اتنی مانوس تری زلفِ رسا ہم سے ہوئی

سر اٹھانے کا بھلا اور کسے یارا تھا
بس ترے شہر میں یہ رسم ادا ہم سے ہوئی

بارہا دستِ ستم گر کو قلم ہم نے کیا
بارہا چاک اندھیرے کی قبا ہم سے ہوئی

ہم نے اتنے ہی سرِ راہ جلائے ہیں چراغ
جتنی برگشتہ زمانے کی ہوا ہم سے ہوئی

بارِ ہستی تو اٹھا اٹھ نہ سکا دستِ سوال
مرتے مرتے نہ کبھی کوئی دعا ہم سے ہوئی

کچھ دنوں ساتھ لگی تھی ہمیں تنہا پاکر
کتنی شرمندہ مگر موجِ بلا ہم سے ہوئی

(1965)

O

اظہارِ حقیقت میں دل و جاں کا زیاں ہے
یہ بھی نہ کہو اب کہ مرے منھ میں زباں ہے

دیکھ آئے ہیں ہم جاکے ہر اک کوچہ و بازار
بس اپنے ہی غم خانے میں تھوڑی سی اماں ہے

دنیا کو پڑی کیا ہے کہ ہر بات کو سمجھے
کہنے کوتو جو دل میں ہے چہرے سے عیاں ہے

تنہا کسی منزل سے گزرنے نہیں دیتی
سائے کی طرح ساتھ لگی عمرِ رواں ہے

کتنوں کی کمر جھک گئی اس دورِ خرد میں
دیوانہ مگر اب بھی اُسی طرح جواں ہے

ہم ہیں کہ اٹھانے کو چلے پردۂ افلاک
اور سینۂ گیتی پہ وہی سنگِ گراں ہے

میخانے سے باہر ہمیں جو چاہو سو کہہ لو
میخانے میں جو شخص بھی ہے پیرِ مغاں ہے

عرصہ ہوا آئی نہیں دل میں کوئی خواہش
کہتے ہیں بہت دیر سے خالی یہ مکاں ہے

(1965)

نظمیں

بن باس

میں کہ خود اپنی ہی آواز کے شعلوں کا اسیر
میں کہ خود اپنی ہی زنجیر کا زندانی ہوں
کون سمجھے گا جہاں میں مرے زخموں کا حساب
کس کو خوش آئے گا اس دہر میں روحوں کا عذاب
کون آکر مرے مٹنے کا تماشا دیکھے
کس کو فرصت کہ اجڑتی ہوئی دنیا دیکھے
کون بھڑکی ہوئی اس آگ کو اپنائے گا
جو بھی آئے گا مرے ساتھ ہی جل جائے گا

وہ گھڑی کون تھی جب مجھ کو ملا تھا بن باس
ایک جھونکا بھی ہوا کا نہ وطن سے آیا
نہ کوئی نکہتِ گل اور نہ کوئی موجِ نسیم
پھر کوئی ڈھونڈنے مجھ کو نہ چمن سے آیا
میں وہ اک لعل ہوں جو بک گیا بازاروں میں
پھر کوئی پوچھنے مجھ کو نہ یمن سے آیا

یاد کرتے ہوئے اک یوسفِ گم گشتہ کو
کچھ دنوں روئی تو ہوگی مرے گھر کی دیوار
کچھ دنوں گاؤں کی گلیوں میں اداسی ہوگی
کچھ دنوں کِھل نہ سکے ہوں گے مرے ہارسنگھار
کچھ دنوں کے لیے سنسان سا لگتا ہوگا
آم کے باغ میں بے چین پھری ہوگی بہار

میں نے اک پیڑ پہ جو نام لکھا تھا اپنا
کچھ دنوں زخم کے مانند وہ تازہ ہوگا
میرے سب دوست اسے دیکھ کے کہتے ہوں گے
جانے کس دیس میں بے چارہ بھٹکتا ہوگا
عمر بھر کون کسے یاد کیا کرتا ہے
ایک اک کرکے مجھے سب نے بھلایا ہوگا

ہائے ان کو بھی خبر کیا کہ وہ اک زخم نصیب
زندگی کے لیے نکلا تھا جو راہی بن کر
آج تک پا نہ سکا چشمۂ آبِ حیواں
اُس کو سورج بھی ملے ہیں تو سیاہی بن کر
گھر سے لایا تھا جو کچھ طبعِ رواں، ذہن رسا
ساتھ اُس کے رہے اسبابِ تباہی بن کر

میرا یہ جرم کہ میں صاحبِ ادراک و شعور
میرا یہ عیب کہ اک شاعر و فنکار ہوں میں
مجھ کو یہ ضد ہے کہ میں سر نہ جھکاؤں گا کبھی
مجھ کو اصرار کہ جینے کا سزا وار ہوں میں
مجھ کو یہ فخر کہ میں حق و صداقت کا امیں
مجھ کو یہ زعم خود آگاہ ہوں خود دار ہوں میں

ایک اک موڑ پہ آلام و مصائب کے پہاڑ
ایک اک گام پہ آفات سے ٹکرایا ہوں
ایک اک زہر کو ہنس ہنس کے پیا ہے میں نے
ایک اک زخم کو چُن چُن کے اٹھا لایا ہوں
ایک اک لمحے کی زنجیر سے میں الجھا ہوں
ایک اک سانس پہ خود آپ سے شرمایا ہوں

یوں تو کہنے کی نہیں بات مگر کہتا ہوں
پیار کا نام کتابوں میں لکھا دیکھا ہے
جب کبھی ہاتھ بڑھایا ہے کسی کی جانب
فاصلہ اور بھی کچھ بڑھتا ہوا دیکھا ہے
بوند بھر دے نہ سکا کوئی محبت کی شراب
یوں تو میخانہ کا میخانہ لٹا دیکھا ہے
(1956)

پیمانِ وفا

میرے گھر کی یہ دیواریں جیسے پی کر بیٹھی ہیں
میرے جلتے جلتے آنسو، میرے لہو کی برساتوں کو
میری تنہائی کے اندھیرے میں آ آ کر ہنستے ہیں
ننھے ننھے کتنے جگنو میری بھیگی پلکوں کے
بجھے دیے کی لو رہ رہ کر آدھی آدھی راتوں کو
اپنی گہری نیند سے جیسے چونک اٹھتی ہے بول اٹھتی ہے
آشاؤں کے سندر مکھڑے پر لالی سی آجاتی ہے
مرجھائے سے نیل کنول کا اور بھی روپ نکھر آتا ہے
دھیرے دھیرے شیتل جل کی لہریں ساز اٹھاتی ہیں
گیتوں کی نرمل دھارا پر ڈول اٹھتی ہے جیون نیا
ہولے ہولے بہتی جائے، بہتی جائے چلتی جائے
سے کی ندی وہ ندی ہے جو ہر اک کو پار لگائے
ندی کے اُس پار کھڑے ہیں میرے بچے میرے بالے
میرے کھیتوں کے سب موتی، میرے خزانے کے رکھوالے
میری طرف سب ہاتھ اٹھا کر جیسے خوشی سے چلاتے ہیں
آؤ آؤ کتنی دیر سے راہ تمھاری دیکھ رہے ہیں

تم کو آج کے دن سورج کی کرنوں میں نہلائیں گے
آج ہم اپنی سالگرہ کا پہلا جشن منائیں گے
(1956)

خلوت کا چراغ

وہ مرے پھول، وہ ہنستے ہوئے سارے چہرے
میرے غم خانے سے رخصت ہوئے اک اک کر کے
پھر وہی میں ہوں ، وہی میری فسردہ راتیں
پھر وہی میں ہوں، وہی میری پرانی باتیں
اسی مانوس سی تصویر کو تکتے رہنا
سوچتے رہنا کہ کچھ اس سے کہوں یا نہ کہوں
کیسے کہہ دوں کہ مرے ہاتھ، یہ ترسے ہوئے ہاتھ
چاہتے ہیں کہ کوئی ہاتھ میں ان کو لے لے
زخم خوردہ ہیں کوئی ان کو سہارا دے دے
کیسے کہہ دوں کہ مرے ہونٹ، یہ جلتے ہوئے ہونٹ
کب سے پیاسے ہیں، بہت پیاسے، بہت پیاسے ہیں
کیسے کہہ دوں مجھے ہونٹوں سے پلا دے کوئی
کیسے کہہ دوں مجھے جینے کی دعا دے کوئی
کیسے کہہ دوں کہ لگا لے کوئی سینے سے مجھے
کیسے کہہ دوں کوئی مجھ سے مرا سب کچھ لے لے
کیسے کہہ دوں کہ مری شمع شبستانِ حیا!
آج کیا ہوگا بہت تیز ہوا چلتی ہے
رس میں ڈوبے ہوئے جھونکے مرے دروازوں سے
آ کے ٹکراتے ہیں، آ آ کے پلٹ جاتے ہیں
اپنا پیراہنِ غم ایک قفس ہے جیسے

راگ کی، رنگ کی، خوشبو کی ہوس ہے جیسے
دل دھڑکتا ہے مرا بات نہ جانے کیا ہو
آج اندھیری ہے بہت رات نہ جانے کیا ہو
آج کی رات کوئی اور بچالے مجھ کو
آج کی رات کوئی اور بچالے مجھ کو

(1956)

فاصلہ

کیا ہوا مجھ کو کہ میں اپنے ہی گھر میں گم ہوں!

وہی دروازے، وہی شیشے، وہی آئینے
لیکن اس درجہ کی وحشت کبھی پہلے تو نہ تھی
اپنے چہرے کو ذرا ہاتھ سے چھوکر دیکھوں
جانے کیوں آج یہ کچھ مجھ کو نیا لگتا ہے
کیوں کہ ایسی مری صورت کبھی پہلے تو نہ تھی

اک ذرا اور قریب آؤ تمھیں پہچانوں
کیا تمھیں ہو؟ یہ وہی تم ہو؟ وہی ہیں خد وخال
وہی جس کے لیے چھپ چھپ کے عبادت کی تھی
جس کے دیکھے سے مرے دل کو سرور آتا تھا

جس کی چاہت ہی میں بیتے ہیں ابھی تک مہ وسال۔
یہ وہی شکل ہے جیسی کہ تمھاری تصویر
جو کہ اب بھی مری دیوار پہ آویزاں ہے
لیکن اس روپ میں کیا کوئی جھلک اور بھی ہے
کیوں کہ اس سے تو کسی جسم کی آنچ آتی ہے
کیوں کہ اس میں تو کسی روح کا غم عریاں ہے

(1957)

بھیرویں

کچّی نیند کے جھونکوں سے
اب مت کھیلو میری رانی!
بھور سمے کی نئی ہوائیں
پاؤں تمھارے چھوتی ہیں
آشاؤں کی سندر سکھیاں
اپنے کنوارے ہاتھوں سے
شبنم سے بھیگی مٹّی پر
نام تمھارا لکھتی ہیں
نیل گگن کی تھال پہ کوئی
پاؤں میں اپنے گھنگرو باندھے
دھیرے دھیرے ناچ رہا ہے
دھرتی کروٹ سی لیتی ہے
کوئی نیا سُر جاگ رہا ہے

مان سرور میں اٹھتے ہیں
میٹھے میٹھے ہلکورے سے
اپنی آنکھیں کھول رہے ہیں
پیارے پیارے پھول کنول کے
کُسم کی پیالی سے رہ رہ کر
اوس کی مدرا چھلک رہی ہے
ہر کونپل انگڑائی لے کر
اپنی سیج پہ اٹھ بیٹھی ہے
پتّا پتّا، بوٹا بوٹا
ذرّہ ذرّہ جاگ رہا ہے

اٹھو اٹھو میری رانی!
میری رانی! جاگو جاگو
آج نیا سورج نکلے گا
آج نیا دن آئے گا
(1957)

آنچل کی چھاؤں میں

آج ہر سمت سے آنچل کی ہوا آتی ہے
کیا کہوں اب کے یہ کس طرح کا آیا موسم
لمحے لمحے کی زباں پر ہے نئی فصل کا گیت
میری بستی، مرے کھیتوں کا عجب ہے عالم
ہنس رہے ہیں مرے معصوم سے ننھے پودے
جن کو ملتی رہی اب تک مرے غم کی شبنم
کوئی گوری لیے آئی ہے چھلکتی گاگر
جس طرح پہلے برستی تھیں یہ آنکھیں چھم چھم
رس بھرے ہونٹوں سے راتوں کے اندھیرے مہکے
اس اندھیرے میں کوئی چھیڑ دے جیسے سرگم
منزلیں اب مرے پاؤں میں بچھی جاتی ہیں
جانے کس سمت لیے جاتا ہے ایک ایک قدم
مجھ سے کہتی ہے مری پیاس یہ جیون بھر کی
اور کچھ اور کہ یہ نشہ ابھی ہے کم کم
رکھ کے سینے پہ مرے ہاتھ کوئی کہتا ہے
اتنے پاگل نہ بنو ہوش میں آؤ بالم!
دیکھو اب جاگ اٹھو، رات کٹی، بھور ہوئی
سیج کے گجروں میں باقی نہ رہا کوئی نم

چل کے پھلواری میں سورج کو نکلتے دیکھیں
چل کے دیکھیں کہ کلی کھلتی ہے کیسے تھم تھم
میرے بالوں میں سجادو کوئی ہنستا ہوا پھول
چل کے ہاتھوں پہ مرے کھاؤ محبت کی قسم

(1958)

سایۂ دیوار

کیسا سنسان ہے دشتِ آوارگی
ہر طرف دھوپ ہے ہر طرف تشنگی
کیسی بے جان ہے میکدے کی فضا
جسم کی سنسنی، روح کی خستگی
اس دوراہے پہ کھوئے گئے حوصلے
اس اندھیرے میں گم ہوگئی زندگی
اے غمِ آرزو میں بہت تھک گیا
مجھ کو دے دے وہی میری اپنی گلی
چھوٹا موٹا مگر خوبصورت سا گھر
گھر کے آنگن میں خوشبوسی پھیلی ہوئی
منہ دھلاتی سویرے کی پہلی کرن
سائباں پر امر بیل مہکی ہوئی
کھڑکیوں پر ہواؤں کی اٹکھیلیاں
روزنِ در سے چھنتی ہوئی روشنی
شام کو ہلکا ہلکا سا اٹھتا دھواں
پاس چولھے کے بیٹھی ہوئی کامنی
اک انگیٹھی میں کوئلے دہکتے ہوئے
برتنوں کی سہانی مدھر راگنی

رس بھرے گیت معصوم سے قہقہے
رات کو چھت پہ چھٹکی ہوئی چاندنی
صبح کو اپنے اسکول جاتے ہوئے
میرے ننھے کے چہرے پہ اک تازگی
رشتے ناطے، ملاقاتیں، مہمانیاں
دعوتیں، جشن، تیوہار، شادی غمی
جی میں ہے اپنی آزادیاں بیچ کر
آج لے لوں یہ پابندیوں کی خوشی

(1958)

اپنے بچّے کے نام

اے مرے سن و سال کے حاصل
میرے آنگن کے نو دمیدہ گلاب
میرے معصوم خواب کے ہم شکل
میری مریم کے سایۂ شاداب
صبح تخلیق کا سلام تجھے
زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب

اے مقدس زمیں کے شعلۂ نو
تو فروزاں ہو اُن فضاؤں میں
میرے سینے کی جو امانت ہیں
جو مری نارسا دعاؤں میں
اس طرح مسکراتی ہیں جیسے
نغمگی دور کی صداؤں میں

مجھ کو اجداد سے وراثت میں
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا

عمر بھر پائمال و خاک بسر
میرا حصہ رہا غمِ فردا
مجھ کو میرے لہو میں نہلا کر
جس نے قیدِ حیات میں رکھا

اے مری روحِ فن کے عکسِ جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہوسکا وہ تو ہوجائے
کاش تو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
اُن دیاروں میں تیرا نام چلے
(1959)

دوسری ملاقات

کہہ نہیں سکتا کہاں سے آئے ہو تم کون ہو
ایسا لگتا ہے کہ یہ صورت ہے پہچانی ہوئی

خاک میں روندا ہوا چہرہ مگر اک دلکشی
آنکھ میں ہلکا تبسم، دل میں کوئی ٹیس سی
پاؤں سے لپٹی ہوئی بیتے ہوئے لمحوں کی گرد
پیرہن کے چاک میں گہرے غموں کی تازگی

پرسشِ غم پر بھی کہہ سکتا نہ اپنے جی کا حال
کچھ کہا تو بس یہی کہ تم پہ کچھ جچتی نہیں
راہ میں چلتے ہوئے ٹھوکر لگی اور گر پڑے
یونہی کانٹے چبھ گئے ہیں، پھٹ گئی ہے آستیں

یاد آتا ہے کہ تم مجھ سے ملے تھے پہلی بار
اک کہانی میں، نہ جانے کس کی تھی لکھی ہوئی
اور میں نے اس طرح کے آدمی کو دیکھ کر
دل میں سوچا تھا کہ اس سے آج کر لوں دوستی

(1959)

پل بھر کا سوانگ

سپنوں کی اک بنجر دھرتی
جو برسوں سے سوئی ہوئی تھی
ایک سہانی صبح
نہ جانے کس کے پاؤں کی آہٹ پا کر
جاگ پڑی تھی
اٹھتے سورج کی کرنوں کو دیکھ رہی تھی

اک ننھی منّی کونپل نے
سر کو اٹھایا
ہر سو دیکھا
دم بھر کو شبنم میں نہائی
دھوپ میں اپنے بال سکھائے
مست پون میں جھولا جھولی
اپنی چھایا میں ناچی
دن جو چڑھا تو یہ مدماتی
مدرا پی پی کر بہکی
ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی
گیتوں کی مالا ٹوٹ گئی

پل بھر کی کیا آنکھ مچولی، پل بھر کا کیا سوانگ
پر ہردے کی سوکھی مٹی جیون رس میں ڈوب گئی

(1959)

شام

خوبصورت شام کہتی ہے کہ آؤ اب چلیں
چل کے ان رستوں پہ ڈھونڈیں اپنی کچھ پرچھائیاں
کل جہاں چھوڑا تھا ہم نے رنگ و بو کا کارواں

چل کے پہچانیں کہ ان میں اپنی قبریں کون ہیں
اس خرابے میں پڑے ہیں جا بجا مٹی کے ڈھیر
جن کی قسمت کو نہ راس آیا دنوں کا ہیر پھیر

کتنی شامیں میں نے رو رو کر گزاری ہیں یہاں
کر چکا ہوں بارہا آکر یہاں پر خودکشی
یہ زمیں میرا لہو پی کر بھی ویسی ہی رہی

پھر کہیں یہ شام بھی جائے نہ اپنی رائیگاں
آج چل کر اپنے قدموں سے یہ قبریں روند دیں
شاید اب کی فصل میں اس خاک سے پودے اُگیں

(1959)

رفتگاں

دروازے اُداس اور گُم سُم
دہلیز کو چپ سی لگ گئی ہے
کیوں دور سے ان کے قہقہوں کی
آتی نہیں آج کوئی آواز
اب کوئی نہ انگلیوں کی جھنکار
نہ قدموں کی کوئی راگنی ہے

کس حال میں ہیں یہ کون جانے
سب اپنے وہ ہم سبق وہ ساتھی
کہہ کر تو گئے تھے پھر ملیں گے
کیا جانیے ان پہ کیسی بیتی
آوارہ ہے کون اب بھی پھرتا
راس آگئی کس کو گھر گرہستی

آتے ہیں بہت سے آنے والے
کچھ اجنبی، کچھ رفیق و ہمدم
لیکن کئی سال مجھ پہ گزرے
سننے کے لیے ترس گیا ہوں
دستک، کہ جو اب بھی جانتی ہو
وہ نام جو میرا پیار کا ہے
(1959)

سوداگر

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ پھر
کاسۂ چشم لے لے کے ایک ایک چہرہ تکوں گا
دفتروں کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جا کر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا

میری آرامِ جاں!
مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو
آج کی شام لوٹوں گا جب
بیچ کر اپنے شفاف دل کا لہو
اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لیے
تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر
میں کہاں جاؤں گا؟
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون ہوں

(1959)

تسلسل

پھر چمکیلی دھوپ آئے گی
فصل پکے گی
گیہوں کے متوالے پودے پھر مستی میں جھوم اٹھیں گے
رس آئے گا
پھر میرے کھیتوں کی ہوائیں خوشبوؤں میں جھولیں گی

گاؤں کی سونی پگڈنڈی پر دھیرے دھیرے چلتا ہوں
شبنم کے موتی کی مالا
میرے قدموں سے ٹکرا کر
ٹوٹ رہی ہے
گھاس کی ہر ہر پتی
کس کے دھیان میں ڈوب گئی ہے

بیتے لمحوں کی آوازیں
پھر کانوں میں آتی ہیں
کل بھی یہی سورج نکلا تھا
صبح کی میٹھی نرم ہوا میں
ذرّہ ذرّہ پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا
شام ہوئی تو میرا اپنا سایہ مجھ سے روٹھ گیا تھا
میرے اپنے پاؤں کے نیچے دفن ہوا تھا

(1959)

نیا عہد نامہ

برسوں سے یہ بام و در کہ جن پر
مہکی ہوئی صبح کے ہیں بوسے
یادوں کے یہی نگر کہ جن پر
سجتے ہیں یہ شام کے دھندلکے
یہ موڑ یہ رہگور کہ جن پر
لگتے ہیں اداسیوں کے میلے

ہیں میرے عزیز، میرے ساتھی
کب سے مرا آسرا رہے ہیں
سنتے ہیں یہ میرے دل کی دھڑکن
جیسے یہ مجھے سکھا رہے ہیں
ہنس بول کے عمر کاٹ دینا
میرے یہی دست و پا رہے ہیں

برسوں سے یہ میری زندگی ہیں
برسوں سے میں ان کو جانتا ہوں
ہیں میری وفا پہ یہ بھی نازاں
ہر بات میں ان کی مانتا ہوں
لیکن مرے دل کو کیا ہوا ہے
میں آج کچھ اور ٹھانتا ہوں

لگتا ہے یہ شہر دلبراں بھی
ہے پاؤں کی میرے کوئی زنجیر
بس ایک ہی رات ایک دن ہے
ہر روز وہی پرانی تصویر

ہر صبح وہی پرانے چہرے
ہوجاتے ہیں شام کو جو دلگیر

اب اور کہیں سے چل کے دیکھیں
کس طرح سحر کی نرم کلیاں
کرنوں کا سلام لے رہی ہیں
جاگ اٹھتی ہیں کس طرح سے گلیاں
سب کام پہ ایسے جارہے ہوں
جیسے کہ منائیں رنگ رلیاں

دیکھیں کہیں شام کو نکل کر
ڈھلتے ہوئے اجنبی سے سائے
یوں ہاتھ میں ہاتھ لے رہے ہوں
جیسے کہیں گھاس سرسرائے
اس طرح سے پاؤں چل رہے ہوں
جیسے کوئی پی کے لڑکھڑائے

آنے ہی کو ہوں ملن کی گھڑیاں
سورج کہیں غم کا ڈوبتا ہو
مہکی ہو کہیں پہ شب کی دلہن
کہسار کہیں پہ کھل رہا ہو
ہر گام پہ اک نیا ہو عالم
ہر موڑ پہ اک نیا خدا ہو
(1960)

وجدان

دھوپ معمول سے بھی سوا تیز ہے
کوئی بادل کا ٹکڑا نہیں
کوئی سایہ نہیں
روشنی، چڑھتے سورج کی یہ روشنی
مجھ کو گھیرے ہوئے ہے
ایسا لگتا ہے جیسے بہت بھیڑ ہو
ہر طرف شور و غل، ہر طرف قہقہے
میں کسی سے بھی کچھ کہنا چاہوں
تو شاید نہ اب کہہ سکوں

میں اسی روشنی میں
کھلی آنکھ سے راستے کی طرف اپنے تکتا ہوا
ساری آوازیں سنتا ہوا
ایک لمحے کو خود اپنے ہی آپ سے
ہو کے رخصت وہاں جا نکلتا ہوں
جس راستے میں کوئی قافلہ
نرم معصوم پھولوں کے اک کنج میں
چھاؤں میں خوبصورت درختوں کی
اس طرح بیٹھا ہوا ہے
جیسے اس قافلے کا ہر اک فرد
گم سم ہے، چپ چاپ ہے
اور ہر شخص خود اپنی آواز سننے میں مصروف ہے
(1960)

سلسلے سوالوں کے

دن کے قہقہوں میں بھی رات کا سا سناٹا
رات کی خموشی میں جیسے دن کے ہنگامے
جاگتی ہوئی آنکھیں نیند کے دھندلکوں میں
خواب کے تصور میں اک عذابِ بیداری
روز و شب گزرتے ہیں قافلے خیالوں کے
صبح و شام کرتے ہیں آپ اپنی غمخواری
ہم کہاں ہیں؟ ہم کیا ہیں؟ کون ہیں؟ مگر کیوں ہیں؟
ختم ہی نہیں ہوتے سلسلے سوالوں کے

چشمۂ ہدایت ہے علم کے صحیفوں میں
فن کے شاہکاروں میں اک چراغِ عرفاں ہے
مرحمت کے ساماں ہیں ان کی بارگاہوں میں
مفت جو لٹاتے ہیں اب بھی اپنی دانائی
رزم گاہِ ہستی میں اپنوں اور غیروں نے
جس سے روشنی پائی ، جو عمل کی راہوں میں
کتنے کم نگاہوں کی مشکلوں میں کام آئی

ہم نے ان چراغوں کو، ہم نے ان صداؤں کو
اپنی خواب گاہوں میں بارہا بلایا ہے
حال سب سنایا ہے اپنی آرزوؤں کا
اپنے دل کے زخموں کا بھید سب بتایا ہے
دو قدم مگر چل کر داغ کچھ نئے ابھرے
پھر خلائے بے پایاں، پھر وہی اندھیرے تھے
ہر چراغ سے روٹھی جیسے اپنی بینائی
ہر صدا پہ غالب تھی جیسے اپنی تنہائی

(1960)

خوابوں سے ڈر لگتا ہے

کل کا سورج اسی دہلیز پہ دیکھے گا مجھے
کل بھی کشکول مرا شام کو بھر جائے گا
کل کی تخلیق بھی ہوگی یہی اک نانِ جویں
کل بھی ہر دن کی طرح یونہی گزر جائے گا

بھوک کی آگ جو بجھتی ہے تو نیند آتی ہے
نیند آتی ہے تو کچھ خواب دکھاتی ہے مجھے
خواب میں ملتے ہیں کچھ لوگ بچھڑ جاتے ہیں
ان کی یاد اور بھی رہ رہ کے ستاتی ہے مجھے

کل بھی ڈھونڈوں گا انھیں جا کے گلی کوچوں میں
کل بھی مل جائیں گے ان خوابوں کے پیکر کتنے
کل بھی یہ ہاتھ لگاتے ہی بدل جائیں گے
کل بھی پھینکیں گے مری سمت یہ پتھر کتنے

آج کی رات مجھے نیند نہیں آئے گی
آج کی رات مجھے خوابوں سے ڈر لگتا ہے

(1961)

قیدی

ایک بار اپنا بنا کر جو مجھے چھوڑ گئی
اُسی روٹھی ہوئی خوشبو کا پجاری ہوں میں

ہر گزرتی ہوئی آواز بلاتی ہے مجھے
لحہ لحہ مری پرسش کے لیے آتا ہے

صبح کی پہلی کرن پوچھتی ہے نام مرا
شام کا سایہ مجھے چھو کے چلا جاتا ہے

ہر دریچہ مجھے تکتا ہے بڑی حسرت سے
اور ہوا ڈھونڈتی پھرتی ہے مرے غم کے چراغ
مجھ سے ہر رات یہ کہتی ہے مری سمت آؤ
مجھ سے ہر چاند نے مانگے ہیں مری روح کے داغ

میں کسی کو نہ سناؤں گا کہانی اپنی
کچھ کہوں گا تو میں اس راہ میں کھو جاؤں گا
اور جس روز یہ زنجیر مری ٹوٹ گئی
مجھ کو ڈر ہے میں کسی اور کا ہو جاؤں گا

(1961)

دن کے خواب

کئی ایسے چہرے، کئی ایسے منظر
جنھیں دیکھنے کو طبیعت نہیں چاہتی ہے
مگر دیکھتے ہیں۔
مگر دیکھتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں
کہ شاید یہ کچھ بھی نہ ہو خواب ہو
ابھی آنکھ کھل جائے گی
اور ہم اپنے گھر میں
کسی نرم بستر پہ لیٹے ہوئے کہہ رہے ہوں گے رانی!
ذرا چائے کی ایک پیالی پلا دو

(1962)

میں اور "میں"

نیند کی وادی میں لے آئی ہے دن بھر کی تھکن
بسترِ گل سے بھی بڑھ کر ہے ہر اک بسترِ خاک
رات کو لاؤ سبھی روشنیاں گل کردو
جسم بھی سوئے گا اور سوئیں گے ذہن و ادراک

رات تو آئی مگر روشنیاں گل نہ ہوئیں
میرے پہلو میں کوئی آگ سلگتی ہے ابھی
ہر بنِ مو سے صدا آتی ہے جاؤ جاؤ
ڈھونڈ کر لاؤ وہ اک شے جو کہیں گم کردی

پا برہنہ میں یونہی گھر سے نکل آیا ہوں
سر کو ٹکراتا ہوں اور زور سے ہوں چلاتا
اے خداؤ مرا سجدہ مجھے واپس کردو
ورنہ شیطان مرا مجھ کو نہ سونے دے گا

(1963)

بدلتے موسم

وہی پیارے مدُھر الفاظ، میٹھی رس بھری باتیں
وہی روشن رو پہلے دن، وہی مہکی ہوئی راتیں
وہی میرا یہ کہنا تم بہت ہی خوبصورت ہو
تمھارے لب پہ یہ فقرہ کہ تم ہی میری قسمت ہو
وہی میرا پرانا گیت تم بن جی نہیں سکتا
میں ان ہونٹوں کو پی کر اب کوئی مے پی نہیں سکتا

یہ سب کچھ ٹھیک ہے پر اس سے جی گھبرا بھی جاتا ہے
اگر موسم نہ بدلے آدمی اُکتا بھی جاتا ہے
کبھی یونہی سہی میں اور کو اپنا بنا لیتا
تمھارے دل کو ٹھکراتا، تمھاری بد دعا لیتا
کبھی میں بھی یہ سنتا تم بڑے ہی بے مروّت ہو
کبھی میں بھی یہ کہتا تم تو سرتاپا حماقت ہو

اب آؤ یہ بھی کر دیکھیں تو جینے کا مزا آئے
کوئی کھڑکی کھلے اس گھر کی اور تازہ ہوا آئے

(1963)

تنہائی سے آگے

اور یہ سب بخششیں جو گھس پٹ کے پرانی ہو جائیں
جب کوئی رس نہ ہو دہرائی ہوئی باتوں میں
مضمحل روحیں خموشی کا سہارا ڈھونڈیں
جب کوئی لطف نہ رہ جائے ملاقاتوں میں

جب نہ محسوس ہو کچھ گرمیِ آداب و سلام
جی نہ چاہے کہ کوئی پرسشِ احوال کرے
دور تک پھیلی ہوئی دھند ہو سناٹے ہوں
سب کے سب بیٹھے ہوں اور کوئی نہ ہو، کچھ نہ رہے

ان خلاؤں سے نکل کر کہیں پرواز کریں
آؤ کچھ سیر کریں ذہن کی پہنائی میں
کیوں نہ دریافت کریں ایسی اگزرگاہوں کو
بات کرتی ہیں مسافر سے جو تنہائی میں

جان پہچان کے کچھ لوگ وہاں نکلیں گے
کوئی ایسا کہ جسے دیکھ کے ہم یہ سوچیں
یہ خدوخال، یہ چہرہ تو ہے مانوس بہت
نام اب یاد نہیں، اس سے یہ کیسے پوچھیں

یا کبھی حافظہ دہرائے گا ایسا اک نام
دل کہے گا کہ یہ تھا اپنا ہی ملنے والا
اس کی صورت مگر اب ٹھیک سے کچھ یاد نہیں
سوچتے ہی رہیں وہ کیسا تھا، وہ کیسا تھا

(1964)

ذاتیات

جو مجھ پہ بیتی ہے
اس کی تفصیل میں کسی سے نہ کہہ سکوں گا
جو دکھ اٹھائے ہیں،
جن گناہوں کا بوجھ سینے میں لے کے پھرتا ہوں
ان کو کہنے کا مجھ کو یارا نہیں ہے
میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں
داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگزشت میری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
تو راہ چلتے میں ٹوک کر مجھ سے جانے کیا پوچھنے لگیں گے

(1965)

ہجویات

تذکرہ شعرائے اردو

بعد تسبیح و حمدِ ربِّ جلیل
لب کشا یوں ہے خاکسار خلیلؔ

مجھ کو دعوائے علم و فضل نہیں
شعر فہمی میں کوئی دخل نہیں

میں نہ عالم نہ کوئی اہلِ زباں
مجھ کو آتا نہیں بدیع و بیاں

پھر بھی کرتا ہوں خامہ فرسائی
اپنے سر لے رہا ہوں رسوائی

جی میں ہے اک تذکرہ لکھوں
سوچتا ہوں مگر کہ کیا لکھوں

مجھ کو ہونے نہ دیں گے اہلِ وطن
پیرو شیفتہؔ و میر حسنؔ

ان بزرگوں میں تھے سبھی شاعر
کہیں دو چار ہوں گے نا شاعر

ہے مگر یہ فضائے عہدِ جدید
کہ ہے اب شاعروں کا قحطِ شدید

ایک دو ہیں کہیں جو بے چارے
وہ بھی پھرتے ہیں در بدر مارے

کوئی اس جنس کا نہیں خواہاں
اب سمجھتا ہے کون ان کی زباں

ہر طرف ہیں مشاعرے برپا
جن میں لے لے کے نام اردو کا

سارے قوّال، ڈوم اور ڈھاڑی
کنجڑے، قصاب اور پنواڑی

بھیس میں شاعروں کے آتے ہیں
غزلیں سب لحن سے سناتے ہیں

پڑھتے ہیں یوں کلامِ بازاری
جیسے سب بیچتے ہوں ترکاری

خیر ان شاعروں کا کیا مذکور
جو ادب میں نہیں کہیں مشہور

ان کو بس واسطہ کمائی سے
کیوں چھپیں پکّی روشنائی سے

لیکن ان میں اک ایسا طبقہ ہے
جس کا ہر جا کلام چھپتا ہے

دوستی ان کی ہر اڈیٹر سے
ہر منسٹر سے، ہر گورنر سے

دعوتیں ہر جگہ اڑاتے ہیں
پوز کیا کیا نئے بناتے ہیں

ہر رسالے میں ان کی اک تصویر
ان کی ہر نظم جیسے اک تقریر

ہیں ادب کے یہ مفتی و قاضی
خوب کرتے ہیں پمفلٹ بازی

ریڈیو والے ان کے سب ہیں مرید
فلم والے ہیں ان کے فن کے شہ

ہر جگہ کیک پیسٹری کھائیں
قحط پر پھر بھی گیت لکھ جائیں

ان کو اپنا بتائیں سب مزدور　　سب میں کہلائیں شاعرِ جمہور
چین پر، کوریا پر، لنکا پر　　مصر پر، جرمنی پہ، جاوا پر
نظمیں لکھ لکھ کے خوب لاتے ہیں　　گھر پہ سب خیریت بتاتے ہیں
کون آئینہ ان کو دکھلائے　　سب میں رجعت پسند کہلائے
آرٹ اور فن کا ان سے نام نہ لو　　عقل سے اپنی کوئی کام نہ لو
جو بھی ناشاعر ان کو کہتا ہے　　عمر بھر سب کے طعنے سہتا ہے
جو بھی تھا نیک آج بد ٹھہرا　　ان کا ہر حرف مستند ٹھہرا
اب یہی رہبرانِ اردو ہیں　　اب یہی پاسبانِ اردو ہیں
عہدِ نو کے مولفوں سے کہو　　تمھیں اب ان کا تذکرہ لکھو
بندہ اس سلسلے میں ہے معذور　　اس کو جانا ہے پیشِ ربِّ غفور
میں کبھی ان کا ہمنوا نہ ہوا　　''گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا''
ہم سے مت پوچھیے کہ یہ کیا ہے　　''ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے''

اس کی تفصیل کس کو بتلائیں
''ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں''

نقد نامہ

کیا کہوں تم سے حال اردو کا　　ہے چمن پائمال اردو کا
خاک اب آئے لطفِ شعروسخن　　ہر طرف پھر رہے ہیں زاغ وزغن
کچھ اسیرانِ فکر جامد ہیں　　کچھ نئی شاعری کے ناقد ہیں
ہیں کہیں پر مدرسی کرتے　　دستِ شفقت ادب پہ ہیں دھرتے
جھوٹ سچ جو بھی کچھ پڑھاتے ہیں　　روٹیاں تو اسی کی کھاتے ہیں
یہ نہیں اس پہ اکتفا کرلیں　　جی میں ہے ان کے اور کیا کرلیں
ڈگریوں کی کچھ اور قیمت ہو　　کچھ کمائی کی اور صورت ہو
شعروافسانہ ان کے بس میں نہیں　　سوزِ پروانہ اس مگس میں نہیں
ان کی اپنی گرہ تو ہے خالی　　کرتے ہیں یہ ادب کی دلالی

نثر لکھتے ہیں اشتہاری سی ۔۔۔ پاس رکھتے ہیں اک پٹاری سی
جس میں کچھ کھیل ہیں تماشے ہیں ۔۔۔ چند اخبار کے تراشے ہیں
اک رجسٹر ہے صرف ناموں کا ۔۔۔ جس میں خانہ الگ اماموں کا
کسی پرچے کا جو اڈیٹر ہو ۔۔۔ یا کسی محکمے کا افسر ہو
یا کہیں ریڈیو پہ ہو نوکر ۔۔۔ یا کسی فلم کا ہو پروڈیوسر
اس کو یہ مستند ادیب کہیں ۔۔۔ یا نئے دور کا نقیب کہیں
باقی فہرست خاکساروں کی ۔۔۔ یعنی اک دو نہیں ہزاروں کی
کیسے کیسے ادیب رنگا رنگ ۔۔۔ ماں ہے ٹینی کسی کی، باپ کلنگ
کوئی لنگڑا ہے کوئی لولا ہے ۔۔۔ کوئی آندھی کوئی بگولا ہے
ہے کوئی دوست ان کے بھائی کا ۔۔۔ یا جمعدار ہے صفائی کا
جس نے دو شعر کر لیے موزوں ۔۔۔ یا کہانی نما کوئی مضموں
لکھ کے چھپوا لیا رسالوں میں ۔۔۔ وہ غریب آ گیا حوالوں میں
نام پر اس کے کاروبار چلا ۔۔۔ اس کا اور اپنا اشتہار چلا
جائزوں کی ہے گرم بازاری ۔۔۔ ہے ٹکے سیر شاعری ساری
جس کو چاہیں بنا دیں کالیداس ۔۔۔ چاہے اس کا کلام ہو بکواس
جو نہ کرتے ہوں ان کو جھک کے سلام ۔۔۔ ان پہ شعر و ادب ہے اک الزام
ہم ہوئے تم ہوئے خلیلؔ ہوئے ۔۔۔ ان کی نظروں میں سب ذلیل ہوئے
پاک ہو جو اسے بتائیں پلید ۔۔۔ الغرض یہ ہیں ناقدانِ جدید
جوتیوں میں یہ بانٹتے ہیں دال ۔۔۔ منہ چھپاتے ہیں ان سے اہلِ کمال
آج سب طائرانِ خوش الحان ۔۔۔ پڑھتے ہیں کلُّ من علیہا فان

دیکھیے کب تلک یہ لیل و نہار
وقنا ربنا ۔ عذاب النار

شہر آشوب

جنابِ اعظمی! کیوں آپ ہیں اُداس و ملول
ہوا ہے خانۂ دل میں یہ کس بلا کا نزول
ہیں بال بال پریشاں، اٹی ہوئی ہے دھول
کسی سے بات بھی کرتے ہیں اب تو اول جلول
کہاں گیا وہ توازن، وہ ضبطِ غم کے اصول

عزیزِ من! مجھے کچھ بھی نہیں ہوا ہے مگر
خدا نے دی ہیں جو آنکھیں یہ میرے چہرے پر
سمجھ میں اب نہیں آتا کھلی رکھوں کیوں کر
مجھے عجیب سا لگتا ہے آج ہر منظر
بدل گئے ہیں زمین و زماں کے سب معمول

ہے چہل پہل بہت، شہر خوب ہیں آباد
مگر کہیں نہیں ملتی ہے روحِ آدم زاد
جسے قریب سے دیکھو وہی ہے گرگ نژاد
چمن میں آج نہیں کوئی خطرۂ صیاد
کہ ہیں بھرے ہوئے زاغ و زغن، چغد چنڈول

ذلیل و خوار وہی ہیں جو اب ہیں اہلِ کمال
ہیں فاقہ مست جو اب ڈھونڈتے ہیں اکلِ حلال
نہیں شریفوں کو ملتی ہے آج روٹی دال
مگر رذیلوں کی جھولی میں ہے ہر اک تر مال
انھیں پہ فضلِ خدا ہے کہ جو ہیں سخت فضول

اسی کی آؤ بھگت جس کو آئے دلالی
جو کھودتا ہو جڑیں سب کی ہے وہی مالی

اُسی کا نام مسیحا کرے جو پامالی
اُسی کو عدل کا دعویٰ جو عدل سے خالی
اُسی کی عقل کا چرچا کہ جو ہے نامعقول

بغل میں جس کی ہو اب رڈیوں کا پشتارہ
اُسی کے علم کا بجتا ہے خوب نقارہ
وہی ہے صاحبِ فن جو ہے فن کا ہرکارہ
ہو جس کا نام چلے ہے اسی کا پوبارہ
جو منبروں پہ کھڑا ہو وہی ہے آج رسول

جو اپنی ذات سے اک مرکزِ جہالت ہو
جو کوڑھ مغز ہو جو تودۂ حماقت ہو
وہ جس کی منصبِ اعلیٰ کے بل پہ شہرت ہو
اُسی کو پیش ہر اک کرسیٔ صدارت ہو
اُسی کے سر پہ نچھاور ہوں ساری قوم کے پھول

وہ درسگاہوں میں تعلیم پر ہیں اب مامور
کہ جن میں علم نہ دانش نہ زندگی کا شعور
کسی کے رُخ پہ خباثت، کسی کے سر میں فتور
ملے جو موقع تو بن بیٹھیں نادر و تیمور
یہ دے کے ڈگریاں کرتے ہیں ان کے دام وصول

وہ جن کے نام کے آگے لگا ہے پروفیسر
کوئی غلام چڑی کا تو ہے کوئی جوکر
کسی کا چہرہ ہونق، کسی کا دل پتھر
اکڑتے پھرتے ہیں یوں جیسے چنگی کے افسر
یہ جمع کرتے ہیں بازارِ علم کے محصول

عجب طرح کے ہیں اب نونہالوں کے اطوار
نہ ان میں ذوقِ نمو، نے صلابتِ اظہار

یہ وضع قطع سے لگتے ہیں فلم کے کردار
بس ایک فکر کہ ہم بن سکیں دلیپ کمار
یہ ہیرو اپنی اداؤں کے آپ ہیں مقتول

نہ ان میں میرؔ نہ غالبؔ نہ کوئی تلسی داس
نہ جستجوئے ہنر ہے، نہ کوئی علم کی پیاس
وہ کہتے ہیں کہ ہے یہ شعر و فلسفہ بکواس
ہمارے جسم پہ سجتا ہے صرف چست لباس
مکالماتِ فلاطوں کو پڑھ کے کیا ہے حصول

جو دیویاں تھیں وہ کرتی ہیں اب نئے فیشن
کوئی ہے زلف بریدہ تو کوئی کجلی بن
بتائے کون کنواری ہیں یا کہ یہ دُلہن
نہ ان کی مانگ میں سیندور نہ ہاتھ میں کنگن
نہ ان کی ناک میں تنکا نہ ان کے کان میں پھول

مشاعروں میں غزل خواں ہیں شاعرانِ کرام
سنا رہے ہیں بڑے تال سُر سے اپنا کلام
جو کامیاب گوئیے ہیں ان کے اونچے دام
بدل سمجھتا ہے مجرے کا اس کو مجمعِ عام
غزل ہو پست تو کچھ اور ہوتی ہے مقبول

پڑھے لکھوں میں نئی شاعری کا چرچا ہے
ہر ایک مجتہدِ عصر بن کے بیٹھا ہے
مگر رسالوں میں ایسا کلام چھپتا ہے
کہ جس کا کوئی نہ اُلٹا ہے اور نہ سیدھا ہے
ہے ناقدوں کی سزا یہ بٹھائیں اس کی چول

یہاں ادیب تو کم ہیں مگر بہت نقاد
کہ جن کا علم بہت سرسری و نام نہاد

کوئی کلرک کوئی مدرسے کا ہے اُستاد
رٹی رٹائی سی کچھ اصطلاحیں ان کو یاد
کہ جن کو اپنے مضامیں میں کرتے ہیں منقول
ہے ناشروں کو شکایت ادب نہیں بکتا
یہ سوچتے ہیں کریں کاروبار کوئلے کا
وہی کتابیں جو ہیں فحش، مبتذل، گھٹیا
بس ان کو چھاپ کے ہوتا نہیں کوئی گھاٹا
کہ آج خلقِ خدا کرتی ہے انھیں کو قبول
بڑے فروغ پہ ہے آج فلم کا بیوپار
تجوریاں لیے بیٹھے ہیں سیٹھ ساہوکار
وہی گھسے ہوئے قصے، وہی پٹے کردار
وہی سڑی ہوئی رومانیت کہ جس کے شکار
تمام کوچہ و بازار، کالج و اسکول
منگائی جاتی ہیں جاسوسی ناولیں گھر گھر
عجیب نشہ سا ہوتا ہے جن کو پڑھ پڑھ کر
کمی سی رہتی ہے ملتا نہیں جو فلم فیئر
ریلیز کیوں نہ ہوئی بن رہی ہے جو پکچر
پہن کے نکلیں گے جس میں گدھے سنہری جھول
ہمارے مورث و اجداد پیٹتے تھے لکیر
اسی لیے تو بنے رہ گئے حقیر و فقیر
مگر یہ ہم کہ جو روشن خیال و با تدبیر
رہیں گے توڑ کے رسم و رواج کی زنجیر
رہے گا اب نہ کوئی فرق فاعل و مفعول
اب اس کے آگے کہوں گا تو ہوں گے سب برہم
اگرچہ اس میں نہیں جھوٹ کچھ خدا کی قسم

بدل گیا وہ زمانہ، بدل گئے موسم
گئے دنوں کا کہاں تک کریں گے ہم ماتم
اسی میں خیر ہے اب اور دیں سخن کو نہ طول
(1961)

ناجنس

باسی الفاظ ان کے باسی ہنسی
صورتیں مسخ آنکھیں پتھریلی
ہربُنِ مو حسد کی آگ میں گرم
زہر بوتے تمام عمر کٹی

ہر گھڑی ہیں وہی گلے شکوے
سب کی کمزوریوں پہ خوب نظر
اپنے گھر پر دبیز سی چلمن
غیر کے گھر کی ایک ایک خبر

"ذکر خیر" اس کا جو نہ ہو موجود
دوست دشمن کی اس میں کیا تفریق
جیسے سارے جہاں کا درد انھیں
ان سے شرمائیں ناصحانِ شفیق

جانے یہ کس طرح کی ہے مخلوق
آج تک جس سے اجنبیت ہے
یہ نہ آئیں تو ان سے خوف رہے
یہ جو آئیں تو ان سے وحشت ہے

پھر کسی نے وہ آ کے دستک دی
لو کہ غارت ہوئی پھر آج کی شام
گھر کا دروازہ بند رہنے دو
آج لینے دو مجھ کو کچھ آرام
(1959)

زندگی اے زندگی

(آخری مجموعہ کلام)

جانے کیوں اک خیال سا آیا
میں نہ ہوں گا تو کیا کمی ہوگی

چند باتیں

میرے شوہر خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کے انتقال کو چار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں۔ مرحوم کے اس آخری مجموعۂ کلام کی اشاعت میں کافی تاخیر ہو گئی ہے، اس تاخیر کی تھوڑی بہت میں بھی ذمہ دار ہوں کیونکہ اس کی اشاعت کا آخری فیصلہ بھی مجھی کو کرنا تھا اور میں اس کو ٹالتی رہی کہ اس مجموعے میں شامل زیادہ تر شاعری ان دو سالوں کی یادگار ہے جب وہ موت سے دست و گریباں تھے اور میں بے بسی سے اس جنگ کے انجام کا انتظار کر رہی تھی!

مرحوم نے، ڈاکٹروں نے اور مرحوم کے احباب نے مجھے ہر لمحہ یہی یقین دلایا کہ وہ بہت جلد صحت یاب ہو جائیں گے اور میں حقیقت کو جانتے ہوئے صرف ان کے حوصلے اور ہمت کو بڑھانے کے لیے اس جھوٹ کو سچ سمجھنے کا ڈرامہ کرتی رہی۔ ان دو سالوں میں مجھ پر کیا کچھ نہ بیت گئی۔ خدا گواہ ہے کہ میں نے مرحوم کی تیمارداری اور دیکھ بھال میں کچھ کسر نہیں اٹھا رکھی۔ مگر خدا جانے کیوں دل سے یہ خیال نہیں نکلتا کہ کہیں نہ کہیں مجھ سے کچھ بھول چوک ہو گئی ہے کیونکہ مرحوم موت سے یوں شکست کھانے والے نہ تھے، زندگی سے محبت کس کو نہیں ہوتی لیکن موت اور زمانے سے بیک وقت مردانہ وار لڑنے کا حوصلہ بہت کم لوگوں میں ہوتا ہے، مرحوم نے بغیر کسی کی مدد کے اس جنگ کو آخر تک جاری رکھا۔

جب بھی مجھے ان کی تخلیقات کا خیال آیا جو مرحوم نے ان دو سالوں میں لکھیں موت اور زمانے کی پرچھائیاں میرے سامنے ناچنے لگیں۔ میں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کی خاطر ان سے آنکھیں چار کرنے سے گریز کرتی رہی۔ اس وقت بھی میں ان چیزوں کو بغیر دیکھے اتر پردیش

اردو اکادمی کے حوالے کر رہی ہوں جنھیں ڈاکٹر طارق خلیل (خلیل صاحب کے بھتیجے) نے پنسل سے لکھے ہوئے کٹے پھٹے بے ترتیب کاغذوں سے نقل کیا ہے۔ ڈاکٹر شہریار اور مرحوم کے عزیز شاگرد ابوالکلام قاسمی نے اس مجموعہ کو مرتب کیا ہے۔ ان لوگوں کے بقول یہ مجموعہ ''نیا عہد نامہ'' کے بعد کے کلام پر مشتمل ہے۔ آخر میں چند نامکمل اور ادھوری نظمیں بھی شامل ہیں، ان کی شمولیت کا صرف یہ جواز ہے کہ ان میں موت کے بے رحم رقص کے آہنگ کو لفظوں میں قید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مجموعے کا انتساب مرحوم کی خواہش کے مطابق ان کے بڑے بھائی محترم عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی کے نام کیا جا رہا ہے۔

راشدہ خلیل
اردو باغ، سرسید نگر، علی گڑھ
19 رجنوری 1983

نعت

تھکے ماندوں کو جب بھی مل گیا رستہ محمدؐ کا
رہا تا عمر اُن کے سر پہ پھر سایہ محمدؐ کا

نگہبانی کیا کرتی ہے اس کے نام کی برکت
سفر آساں ہے اس کا جو ہو دلدادہ محمدؐ کا

پلاتا ہے بڑی شفقت سے اپنے تشنہ کاموں کو
بہت شیریں بہت شفاف ہے دریا محمدؐ کا

مجھے سرمست کر دیتی ہے اپنی بوئے پیراہن
سجا رکھا ہے جب سے دل میں گلدستہ محمدؐ کا

بڑا خوش بخت ہے جس کو ملے اس در کا اک ذرّہ
مبارک ہے جو دیکھے گنبدِ خضرا محمدؐ کا

نعت

میں غلامِ مصطفٰےؐ ہوں، میں ہوں شیدائے رسولؐ
میری نظروں میں بسا ہے روئے زیبائے رسولؐ

میری جاں اس پر تصدق، اس کے نام پاک پر
ہر بُنِ مو سے نکلتی ہے صدا ہائے رسولؐ

آب رحمت لے کے آیا سارے عالم کے لیے
تشنہ لب جتنے بھی ہیں ان کا ہے دریائے رسولؐ

یہ وہ گلشن ہے مقدر میں نہیں جس کے خزاں
تا ابد تازہ رہیں گے یوں ہی گلہائے رسولؐ

گونجتی ہے جب کبھی کانوں میں آوازِ اذاں
پھرنے لگتا ہے نگاہوں میں سراپائے رسولؐ

نعت

بھردے، بھردے میرا پیالہ، او مرے کالی کملی والے
میں پیاسا، در در کا نکالا، او مرے کالی کملی والے

تن کا بھوکا، من کا بھوکا، پریم کا بھوکا، پیار کا بھوکا
میں نے نہ چکھا ایک نوالا، او مرے کالی کملی والے

جس جس سے بھی چاہ بڑھائی، چاہ اسی کی راس نہ آئی
کون تھا میرا چاہنے والا؟ او مرے کالی کملی والے

کتنے تھے دل جوڑنے والا، او مرے کالی کملی والے
کوئی نہ تھا دل جوڑنے والا، او مرے کالی کملی والے

ساری بستی جگ مگ جگ مگ، میرے گھر میں دیا نہ باتی
میں نے نہ جانا کیا ہے اُجالا، او مرے کالی کملی والے

میرے ہی گھر پر ساری وبائیں، میرے ہی گھر پر غم کی گھٹائیں
کون تھا اس گھر کا رکھوالا، او مرے کالی کملی والے

گرتا پڑتا آپ سنبھلتا، اب ترے در پر آہی پہنچا
سب پہ ترا در کھلنے والا، او مرے کالی کملی والے

تو ہی مالک، تو ہی داتا، اور کسی سے اب نہیں ناتا
تو سب کو اپنانے والا، او مرے کالی کملی والے

کملی والا، کملی والا، کتنا پیارا نام ہے تیرا
کہہ کے خدا بھی بلانے والا، او مرے کالی کملی والے

احمدِ مرسل، رحمتِ عالم صلّے اللہ علیہ وسلم
تیرا بول ہے سب پر بالا، او مرے کالی کملی والے

یَا اَیُّہَاالْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلاً
(قرآن مجید)

O

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خودنما ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھ نام مرا روحِ کائنات
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں

جب نیند آگئی ہو صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

لاؤں کہاں سے ڈھونڈ کے میں اپنا ہمنوا
خود اپنے ہر خیال سے ٹکرا چکا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ میں تجھے پہچانتا نہیں
اب مجھ کو بھول جا کہ بہت بے وفا ہوں میں

(1966)

O

آئے ہیں اور گزرے ہیں کتنے ہی ماہ و سال
صدیوں سے راستے میں کھڑے ہیں کئی سوال

ہو کوئی ہم پیالہ تو وہ اس کی داد دے
راتوں کا زہر پی کے نہیں دن میں ہم نڈھال

کوئی تو بات ہوگی جو کرنے پڑے ہمیں
اپنے ہی خواب اپنے ہی قدموں سے پائمال

اس فکر میں کہ کل بھی نہ ہو آج کی طرح
ہم کر سکے نہ آج کے زخموں کا اندمال

یہ گردشِ زمیں ہے جو لاتی ہے شامِ غم
ورنہ شعاعِ مہر تو ہوتی ہے لازوال

ہم سا ملے کوئی تو کہیں اس سے حالِ دل
ہم بن گئے زمانے میں کیوں اپنی ہی مثال

(1967)

O

کٹی پھٹی سی یہ روحیں، گلے سڑے یہ بدن
بس اور کچھ نہیں اب ڈھونڈتے ہیں پیراہن

کہیں سے آتی ہے پھر آج بوئے آدم زاد
چلو اسی کو بنالیں رفیقِ رنج و محن

ہمارے عہد سے منسوب کیوں ہوئے آخر
کچھ ایسے خواب کہ جن کا نہیں ہے کوئی بدن

خود اپنے اپنے جہنم میں جل رہے ہیں سبھی
عجیب دور ہے یہ دور آتش و آہن

جو پوچھنا ہے تو اب ان سے راستہ پوچھو
وہ لوگ جن کے دلوں پہ چراغ ہیں روشن

یہ اور بات ہمارے لہو کی پیاسی ہے
مگر زمینِ چمن پھر بھی ہے زمینِ چمن

(1967)

○

سوتے سوتے چونک پڑے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈ رہا ہو ایسا اک رستا دیکھا

دور سے اک پرچھائیں دیکھی اپنے سے ملتی جلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرہ دیکھا

سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا

سوکھی دھرتی سن لیتی ہے پانی کی آوازوں کو
پیاسی آنکھیں بول اٹھتی ہیں ہم نے اک دریا دیکھا

آج ہمیں خود اپنے اشکوں کی قیمت معلوم ہوئی
اپنی چتا میں اپنے آپ کو جب ہم نے جلتا دیکھا

چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایہ دیکھا

رات وہی پھر بات ہوئی نا ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے سے شور سا اک اٹھتا دیکھا

○

ہر ہر سانس نئی خوشبو کی اک آہٹ سی پاتا ہے
اک اک لمحہ اپنے ہاتھ سے جیسے نکلا جاتا ہے

دن ڈھلنے پر نس نس میں جب گرد سی جمنے لگتی ہے
کوئی آکر میرے لہو میں پھر مجھ کو نہلاتا ہے

ساری ساری رات جلے ہیں جو اپنی تنہائی میں
اُن کی آگ سے صبح کا سورج اپنا دیا جلاتا ہے

میں تو گھر میں اپنے آپ سے باتیں کرنے بیٹھا تھا
اَن دیکھا سا اک چہرہ دیوار پہ اُبھرا آتا ہے

کتنے سوال ہیں اب بھی ایسے جن کا کوئی جواب نہیں
پوچھنے والا پوچھ کے ان کو اپنا دل بہلاتا ہے

کس کو سزائے موت ملے گی؟ یہ کیسی ہے بھیڑ لگی
اور کیا اس نے جرم کیا تھا؟ کوئی نہیں بتلاتا ہے

(1967)

○

ہوا کے جھونکے جو آئیں تو ان سے کچھ نہ کہو
جو آگ خود ہی لگائی ہے اس میں جلتے رہو

یہ دل کا درد تو ساتھی تمام عمر کا ہے
خوشی کا ایک بھی لمحہ ملے تو اس سے ملو

ہمیشہ سچ ہی نہیں بولتا ہے آئینہ
خود اپنے آپ سے ہر لحظہ عمر مت پوچھو

یہاں تو کچھ بھی نہیں جز خلائے بے پایاں
ہماری آنکھوں کی گہرائیوں میں مت جھانکو

کھلا ہے اور نہ کھلے گا کسی کا دروازہ
تو آؤ کوچۂ جاناں کو شب بخیر کہو
(1968)

O

دیکھنے والا کوئی ملے تو دل کے داغ دکھاؤں
یہ نگری اندھوں کی نگری کس کو کیا سمجھاؤں

نام نہیں ہے کوئی کسی کا، روپ نہیں ہے کوئی
میں کس کا سایہ ہوں کس کے سائے سے ٹکراؤں

سستے داموں بیچ رہے ہیں اپنے آپ کو لوگ
میں کیا اپنا مول بتاؤں کیا کہہ کر چلاؤں

اپنے سپید و سیہ کا مالک ایک طرح سے میں بھی ہوں
دن میں سمیٹوں اپنے آپ کو رات میں پھر بکھراؤں

اپنے ہوں یا غیر ہوں سب کے اندر سے ہے ایک سا حال
کس کس کے میں بھید چھپاؤں، کس کی ہنسی اڑاؤں

پیاسی بستی، پیاسا جنگل، پیاسی چڑیا پیاسا پیار
میں بھٹکا آوارہ بادل کس کی پیاس بجھاؤں
(1968)

O

کیوں شمع بجھ کے رہ گئی کیسی ہوا چلی
''اے اہلِ بزم کوئی تو بولو خدا لگی''

دنیائے دوں سے بھاگ کے ہم میکدے گئے
اب کیوں ہمارے ساتھ ہے یہ بے حیا لگی

وہ لوگ اب کہاں ہیں وہ چہرے کدھر گئے
اے شہرِ حسن! کس کی تجھے بددعا لگی

ہم کیوں نہ اپنے آپ پہ نازاں ہوں صاحبو!
ہم پر ہی کیوں یہ تہمتِ مہر و وفا لگی

سائے سے کچھ قریب سے ہوکر گزر گئے
پچھلے پہر کو آنکھ ابھی تھی ذرا لگی

آئینے میں یہ کون ہے ہم جانتے نہیں
صورت ذرا ذرا سی ہمیں آشنا لگی

کیا اب ادھر نہ آئیں گے خوشبو کے قافلے
تجھ کو خبر کہاں سے یہ بادِ صبا لگی

ہم جل کے خاک ہوگئے یہ اور بات ہے
کچھ ان کے دل میں آگ تھی ہم سے سوا لگی

کچھ دن رہے تھے زلفِ پریشاں کی قید میں
پھر اپنے ساتھ اور نہ کوئی بلا لگی

ہم تشنہ لب تو تیرے دعاگو ہیں پھر بتا
ہے کون جس کی تجھ کو نظر ساقیا لگی

بس اک حسینؓ کا نہیں ملتا کہیں سراغ
یوں ہر گلی یہاں کی ہمیں کربلا لگی

○

ہر گھڑی عمرِ فرومایہ کی قیمت مانگے
مجھ سے آئینہ مرا میری ہی صورت مانگے

دور رہ کر ہی جو آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں
دلِ دیوانہ مگر ان کی ہی قربت مانگے

پوچھتے کیا ہو ان آنکھوں کی اُداسی کا سبب
خواب جو دیکھے وہ خوابوں کی حقیقت مانگے

اپنے دامن میں چھپا لے مرے اشکوں کے چراغ
اور کیا تجھ سے کوئی اے شبِ فرقت مانگے

وہ نگہ کہتی ہے بیٹھے رہو محفل میں ابھی
دل کی آشفتگی اٹھنے کی اجازت مانگے

زہر پی کر بھی جیوں میں یہ الگ بات مگر
زندگی اس لبِ رنگیں کی حلاوت مانگے

زیب دیتے نہیں یہ طرّہ و دستار مجھے
میری شوریدہ سری سنگِ ملامت مانگے

(1968)

○

خود بخود دور کبھی دل کا اندھیرا نہ ہوا
جب تک اس خاک سے پیدا کوئی شعلہ نہ ہوا

کیا کہیں ہم کہ ازل سے ہی ملی تھی ہم کو
ایسی تنہائی کہ تم سے بھی مداوا نہ ہوا

سرخرو اپنی نظر میں نہ ہوئے ہم جب تک
زیبِ تن، پیرہنِ آتشِ صہبا نہ ہوا

بس مرے پاؤں سے لپٹی رہی آلام کی گرد
دل کا آئینہ کچھ ایسا تھا کہ دُھندلا نہ ہوا

لوگ ہم جیسے تھے اور ہم سے خدا بن کے ملے
ہم وہ کافر ہیں کہ ہم سے کہیں سجدہ نہ ہوا

(1969)

O

کہاں کھوگئی روح کی روشنی — بتامیری راتوں کی آوارگی
میں جب لمحے لمحے کا رس پی چکا — تو کچھ اور جاگی مری تشنگی
اگر گھر سے نکلوں تو پھر تیز دھوپ — مگر گھر میں ڈستی ہوئی تیرگی
غموں پہ تبسم کی ڈالی نقاب — تو ہونے لگی اور بے پردگی
مگر جاگنا اپنی قسمت میں تھا — بلاتی رہی نیند کی جل پری
جو تعمیر کی کنجِ تنہائی میں — وہ دیوار اپنے ہی سر پر گری
نہ جانے جلے کون سی آگ میں — ہے کیوں سر پہ یہ راکھ بکھری ہوئی
ہوئی بارشِ سنگ اس شہر میں — ہمیں بھی ملا حقِ ہم سائیگی
گزاری ہے کتنوں نے اس طرح عمر — بالاقساط کرتے رہے خودکشی
کوئی وقت بتلا کہ تجھ سے ملوں — مری دوڑتی بھاگتی زندگی
جنھیں ساتھ چلنا ہو چلتے رہیں — گھڑی وقت کی کس کی خاطر رکی
میں جیتا تو پائی کسی سے نہ داد — میں ہارا تو گھر پر بڑی بھیڑ تھی
ہوا ہم پہ اب جن کا سایہ حرام — تھی ان بادلوں سے کبھی دوستی
مجھے یہ اندھیرے نگل جائیں گے — کہاں ہے تو اے میرے سورج مکھی

نکالے گئے اس کے معنی ہزار
عجب چیز تھی اک مری خامشی

O

بدلتا رہتا ہے کیا رنگ آسماں دیکھو
فصیلِ شہر سے باہر کا بھی سماں دیکھو

گزر کے آئے ہیں یہ لوگ کس جہنم سے
دلوں کی اور سے اٹھتا ہوا دھواں دیکھو

اسی کی ضد پہ پیا زہر خود شناسی کا
یہ زندگی ہمیں لے جائے گی کہاں دیکھو

رکیں گے جاکے مگر کون سے جزیرے پر
کھلا ہے اب تو خیالوں کا بادباں دیکھو

خوشی کا نام یہ کس طرح مسکراتے ہیں
یہ انتہائے غرورِ فسردگاں دیکھو

(1969)

O

کیا قیامت ہے کہ ہم خود ہی کہیں خود ہی سنیں
ایک سے ایک ابوجہل ہے کس کس سے لڑیں

اور تو کوئی بتاتا نہیں اس شہر کا حال
اشتہارات ہی دیوار کے پڑھ کر دیکھیں

یاں تو سب لوگ ہیں دستارِ فضیلت باندھے
کوئی ہم سا جو ہو محفل میں تو ہم بھی بیٹھیں

جتنے ساتھی تھے وہ اس بھیڑ میں سب کھوئے گئے
اب تو سب ایک سے لگتے ہیں کسے ہم ڈھونڈیں

گھر کی ویرانی طلب کرتی ہے دن بھر کا حساب
ہم کو یہ فکر ذرا شام کو باہر نکلیں

خواب دیکھے نہیں خوابوں کی تمنا کی ہے
رات کس طرح سے کاٹی ہے یہ کیا عرض کریں

حاصلِ عمر بس اک کاسۂ خالی کیوں ہو
اور کچھ بس نہ چلے زہر سے اس کو بھر لیں

ہم سے کیوں پوچھتے ہیں وقت کی رفتار کا حال
آپ کیوں خود ہی نہ مسند سے اتر کر دیکھیں

دل پہ اک بوجھ سا رکھا ہے کسی طور ہٹے
ورقِ سادہ میسر ہو تو ہم بھی لکھیں

O

بنے بنائے سے رستوں کا سلسلہ نکلا
نیا سفر بھی بہت ہی گریز پا نکلا

نہ جانے کس کی ہمیں عمر بھر تلاش رہی
جسے قریب سے دیکھا وہ دوسرا نکلا

ہمیں تو راس نہ آئی کسی کی محفل بھی
کوئی خدا کوئی ہمسایۂ خدا نکلا

ہزار طرح کی مے پی ہزار طرح کے زہر
نہ پیاس ہی بجھی اپنی نہ حوصلہ نکلا

ہمارے پاس سے گزری تھی ایک پرچھائیں
پکارا ہم نے تو صدیوں کا فاصلہ نکلا

اب اپنے آپ کو ڈھونڈیں کہاں کہاں جا کر
عدم سے تا بہ عدم اپنا نقش پا نکلا

O

یہ تمنا نہیں اب داد ہنر دے کوئی
آ کے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

ایک مدت سے ہے دل کا سنہ خالی کی طرح
کسی شیشے میں لہو جو دے تو بھر دے کوئی

ہر جگہ ساتھ رہے گی یہی دیوار کی قید
سر اٹھانے کو ہمیں کون سا گھر دے کوئی

میر محفل کو گوارا نہیں یہ طرز کلام
شمع کشتہ کو جو عنوان سحر دے کوئی

صاحب فن کو بس اک غنچۂ تخلیق بہت
ورنہ بے سود اگر عمر خضر دے کوئی

(1970)

O

خدا کرے کہ انھیں اور کچھ ثبات ملے
یہ چند صورتیں جن پر ہے آدمی کا گماں

O

چکھی ہے لمحے لمحے کی ہم نے مٹھاس بھی
یہ اور بات ہے کہ رہے ہیں اداس بھی

ان اجنبی لبوں پہ تبسم کی اک لکیر
لگتا ہے ایسی شے تھی کبھی اپنے پاس بھی

منسوب ہوں گی اور بھی اس سے حکایتیں
یہ زخمِ دل کہ آج ہے جو بے لباس بھی

پھیلا ہوا تھا صدیوں تلک اس کا سلسلہ
دریا کے ساتھ ساتھ بڑھی اپنی پیاس بھی

ناصرؔ کو رو رہا ہوں کہ تھا میرا ہم سخن
گو اس سے ہو سکا نہ کبھی روشناس بھی

(1972)

O

کیوں میں بے حس بن کے اوروں کی طرح سے زندہ ہوں
کیا بتاؤں میں خود اپنے آپ سے شرمندہ ہوں

قرض سب باقی پڑا ہے لمحۂ موجود کا
کیوں سراپا انتظارِ لمحۂ آئندہ ہوں

اب کوئی ایسا نہیں جس پر کروں سب کچھ نثار
اب تو برسوں سے خود اپنے سائے میں رقصندہ ہوں

رنگ چہروں کے چراغ آنکھوں کے دھندلے پڑ گئے
عکس کس کا دل میں ہے جس کے لیے نالندہ ہوں

میں نہیں ہوں صاحبانِ دست و بازو کا حریف
ایک زہرِ آگہی صد نعمتِ بخشندہ ہوں

(1974)

ان کہی

روز جب صبح کو
اپنے گھر سے نکلتا ہوا
راستے میں کوئی دوست مل جائے
یا جان پہچان والا
میں بڑی گرم جوشی سے اُس کی طرف
بڑھ کے جاتا ہوں
آداب کرتا ہوں
اور مسکراتا بھی ہوں
جیسے میں آج کے دن
بہت خوش ہوں
اور گھر پہ سب خیریت ہے
مجھ کو ہر ہر قدم پر
کئی طرح کے لوگ ملتے ہیں
جو اونچی اونچی دکانوں پر بیٹھے ہوتے ہیں
کئی ایسے افراد
میں جانتا ہوں وہ کتنے غبی ہیں
مگر کرسیوں پر ڈٹے ہیں
انھیں لوگ
جھک جھک کے تسلیم کرتے ہیں
وہ لوگ جو ان سے بہتر ہیں
تہذیب و شائستگی
دانش و آگہی میں
مگر اس کو کیا کیجیے

ان کی قسمت میں وہ خاص کرسی نہیں ہے
کہ جس پر کوئی مسخرا بیٹھ جائے
تو اس کو کوئی مسخرا کہہ نہ پائے
مجھ کو محسوس ہوتا ہے
خود میرے اندر
کوئی بیٹھا ہوا
کہہ رہا ہے
جی میں آتی ہے
ان مسخروں پر ہنسوں
کھوکھلے آدمی جو بھی ہیں
ان سے کہہ دوں کہ تم کھوکھلے ہو
اپنی کرسی پہ بیٹھا ہوا کوئی احمق
اونٹ کی طرح بلبلائے
تو کہہ دوں — کہ کیا بک رہے ہو؟

نیا آدمی

اور پھر یوں ہوا
جو پرانی کتابیں، پرانے صحیفے
بزرگوں سے ورثے میں ہم کو ملے تھے
انھیں پڑھ کے ہم سب یہ محسوس کرنے لگے
ان کے الفاظ سے کوئی مطلب نکلتا نہیں ہے
جو تعبیر و تفسیر
اگلوں نے کی تھی
معانی و مفہوم
جو اُن پہ چسپاں کیے تھے

اب ان کی حقیقت کسی واہمے سے زیادہ نہیں ہے
اور پھر یوں ہوا
چند لوگوں نے یہ آ کے ہم کو بتایا
کہ اب ان پرانی کتابوں کو
تہہ کر کے رکھ دو
ہمارے وسیلے سے
تم پر
نئی کچھ کتابیں اتاری گئی ہیں
انھیں تم پڑھو گے
تو تم پر
صداقت نئے طور سے منکشف ہو گی
بوسیدہ و منجمد ذہن میں
کھڑکیاں کھل سکیں گی
تمھیں علم و عرفان اور آگہی کے
خزینے ملیں گے
اور پھر یوں ہوا
ان کتابوں کو اپنی کتابیں سمجھ کر
انھیں اپنے سینے سے ہم نے لگایا
ہر اک لفظ کا ورد کرتے رہے
ایک اک حرف کا رس پیا
اور ہمیں مل گیا
جیسے معنی و مفہوم کا
اک نیا سلسلہ
اور پھر یوں ہوا
ان کتابوں سے
اک دن
یہ ہم کو بشارت ملی

آنے والا ہے دنیا میں
اب اک نیا آدمی
لے کے اپنے جلو میں نئی زندگی
ہم اندھیری گپھاؤں سے
اوہام کی تنگ گلیوں سے نکلیں گے
ہم کو ملے گی نئی زندگی
اور پھر یوں ہوا
لانے والے کتابوں کے
اور وہ بھی جوان پہ ایمان لائے تھے
سب اپنے اپنے گھروں سے
نکل کر
کسی سمت کو چل پڑے
ایسے اک راستے پر
جدھر سے نیا آدمی
آنے والا تھا
یا ہم کو اس کا یقیں تھا
کہ وہ آئے گا اور اسی سمت سے
بس اسی سمت سے آئے گا
اور پھر یوں ہوا
دیر تک ہم نئے آدمی کے رہے منتظر
دیر تک شوقِ دیدار کی
اپنی آنکھوں میں مستی رہی
دیر تک
اس کی آمد کا ہم گیت گاتے رہے
دیر تک اس کی تصویر
ذہنوں میں اپنے بناتے رہے
دیر تک

اس خرابے میں اک جشن ہوتا رہا
اور پھر یوں ہوا
دیر تک
اور بھی دیر تک
جب نہ ہم کو ملا
آنے والے کا کوئی پتا
اس کے قدموں کی کوئی نہ آہٹ ملی
ہم نے پھر زور سے اس کو آواز دی
''اے نئے آدمی''
اے نئے آدمی!!
اور یہ آواز اونچے پہاڑوں سے ٹکرا
بے نام صحراؤں سے لوٹ کر
پھر ہماری طرف آ گئی
اور پھر یوں ہوا
چند لوگوں نے سوچا کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
دوسرے چند لوگوں نے سوچا
کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
اور پھر ہر طرف قافلے قافلے
اور پھر ہر طرف راستے راستے
اور پھر یوں ہوا
دیر تک اس نئے آدمی کی
رہی جستجو
اس کو آواز دیتے رہے
چار سو
کو بکو، قریہ قریہ

اُسے ہم بلاتے رہے
منزلوں منزلوں
خاک اُڑاتے رہے
اور پھر یوں ہوا
سب کے چہرے اسی خاک میں اٹ گئے
سب کی آنکھوں میں اک تیرگی چھا گئی
سب کو ڈسنے لگی آہ کی بے حسی
اور پھر سب وہ اک دوسرے کے لیے
اجنبی ہو گئے
اور پھر سب کے سب
دھند میں کھو گئے
اور پھر یوں ہوا
ہم نے پھر گھر پہ آ کر
کتابوں کے اوراق کھولے
انھیں پھر سے پڑھنے کی خاطر اٹھایا
ہر اک سطر پر غور کرتے رہے دیر تک
اور ہر لفظ کو
دوسرے لفظ سے جوڑ کر
سلسلہ حرف و نغمہ کا
صوت و صدا کا ملاتے رہے
اور پھر
یاس و امید کے درمیاں
ڈھونڈتے ہی رہے
اس نئے آدمی کا نشاں
اور ہمیں بس ملیں
اپنی آواز کی
زرد سوکھی ہوئی پتّیاں

اور پھر یوں ہوا
ہم سے سورج کئی روز روٹھا رہا
آسمانوں سے اٹھتی رہیں
تہہ بہ تہہ بدلیاں
کالی کالی نظر آئیں سب وادیاں
کالے گھر کالی دیواریں کالی چھتیں
کالی سڑکوں پہ چلتی ہوئی کالی پرچھائیاں
یہ زمیں
کالے ساگر میں
ٹوٹی ہوئی ناؤ کی طرح سے
ڈگمگانے لگی
موت کی نیند آنے لگی
اور پھر یوں ہوا
ہم نے اپنے گھروں میں
جلائے خود اپنے دیے
ہم نے بکھرے ہوئے خواب
ٹوٹے ہوئے آئینے
پھر سے جوڑے
بجھے جسم کی راکھ سے
سر اٹھاتے ہوئے ایک ننھے سے شعلے کو
اور پھر اپنے چہرے میں
ایک اور چہرے کو دیکھا
پھر اپنے لہو کی صدائیں سنیں
اور اپنے لیے آپ اپنی کتابیں لکھیں

(1986)

پچھلے جنم کی کتھائیں

مجھے کچھ نہیں گیان
یہ زندگی کیا ہے؟
یہ موت کیا ہے؟
میں کتنے دنوں سے یہی سوچتا ہوں
کہ میں کیا ہوں، میں کیا نہیں ہوں
مری عمر جس طرح گزری ہے
اس کو بھی کیوں اک عمر کہیے
یہ اک عمر میں تقسیم ہے
اور ہر لمحہ ایک دوسرے سے جدا ہے
جب اک لمحہ مرتا ہے
تو دوسرا لمحہ تخلیق پاتا ہے
پہلو میں آ کر مرے بیٹھ جاتا ہے
اور پوچھتا ہے کہ تم کون ہو؟
میں پھر سوچتا ہوں
کہ میں کون ہوں؟
کیوں کہ میں پچھلے لمحے میں جو کچھ تھا
وہ اب نہیں ہوں
تو کیا میں ہر اک لمحہ پھر سے نیا جنم لیتا ہوں
ہر ایک لمحہ اک عمر ہے؟
تو کیا میں ہر اک لمحہ
ایسی کتھائیں سناتا ہوں
جو پچھلے جنموں سے منسوب ہیں؟

(1962)

حروف والفاظ کے ذخیرے

حروف والفاظ کے ذخیرے
یہی ہیں وہ دائرے
کہ جن میں اسیر تم بھی ہو اور میں — بھی
تمھارا جو نام
چند حرفوں سے مل کے بنتا ہے
چاہے مفہوم اس کا کچھ بھی ہو
چاہے مفہوم سے وہ خالی ہو
چاہے اس کیفیت کے برعکس ہو
جو تم میں نمو پاتی ہے
ایسی اک روح
جو کسی جسم میں
کسی آئینے میں اتری ہو
ایک پیکر میں ڈھل گئی ہو
مرا بھی اک نام ہے
اسی نام سے لوگ مجھے جانتے ہیں
یہ نام بھی
چند الفاظ کو ملانے سے بن گیا ہے
اب اس کا کیا ذکر مجھ پہ یہ کتنا سج رہا ہے
تو کیا ہمارا تمھارا سمبندھ اتنا ہی ہے
کہ چند الفاظ
چند الفاظ سے مل رہے ہیں
مگر اسی نام کے تو کچھ اور لوگ ہوں گے
اگر نہ ہوں گے تو کل اسی نام کے اور کئی لوگ ہوں گے
اگر ہمارا وجود ان سے کچھ ماورا ہے
حروف والفاظ سے سوا ہے
تو اس کے اظہار کا اور ڈھنگ کیا ہے

(1962)

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو
ڈھونڈنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی
کوئی گیان ہوگا
مگر جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر سے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک
بس خلا ہی خلا ہے

(1966)

آئینہ در آئینہ

میں آج سویرے جاگ اٹھا
دیکھا کہ ہے ہر سو سناٹا
چپ چاپ ہے سارا گھر آنگن
باہر سے بند ہے دروازہ
سب بھائی بہن بیوی بچے
آخر ہیں کہاں؟ ہے کیا قصہ
اتنے میں عجب اک بات ہوئی
ناگاہ جو دیکھا آئینہ
اک آدمی مجھ کو آیا نظر
مجھ سے ہی مگر ملتا جلتا
دو سینگ ہیں اس کے سر پہ اُگے
یہ دیو ہے کوئی یا دیوتا
تم کون ہو؟ یہ پوچھا میں نے
پر کوئی نہ مجھ کو جواب ملا
میں کانپ اٹھا تھر تھر تھر تھر
سوچا کہ کروں جھک کر سجدہ
اتنے میں ہوئی اک آہٹ سی
میں سن کے یکا یک چونک اٹھا
اب دیر ہوئی اٹھیے پاپا
ہاں مجھ کو دفتر جانا ہے
اس خواب کا لیکن کیا ہوگا؟

(1966)

لمحے کی موت

کچھ دور تلک
کچھ دور تلک
وہ لمحہ اس کے ساتھ چلا
جب اس نے دل میں یہ سوچا
یہ گرتی دیواریں
یہ دھواں
یہ کالی چھتیں
یہ اندھے دیے
سنولاتے ہوئے سارے چہرے
اب اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گے
جب نگر نگر کی سیاحی
ان ٹیڑھی میڑھی سڑکوں کی
آوارہ گردی
ہنستے جسم
کھنکتے پیالوں
کی موسیقی
اس کو راس نہ آئی
اس نے کہا:
اب آؤ لوٹ چلیں
اک شام وہ اپنے گھر پہنچا
اور اس سے ملنے کو آئے
سب ساتھی اس کے بچپن کے
سب کہنے لگے:

ان جگمگ کرتے شہروں کا
کچھ حال بتاؤ
اپنے سفر کی
کچھ روداد کہو
وہ خاموش رہا
وہ دیکھ رہا تھا اس میلے سے طاق کو
جس پر
اب بھی ایک گھڑی رکھی تھی
اور وہ بند پڑی تھی

(1966)

○

دنیا داری تو کیا آتی، دامن سینا سیکھ لیا
مرنے کے تھے لاکھ بہانے پھر بھی جینا سیکھ لیا

ایسے درویشوں سے بھی نبھائی، اپنی ہنسی بھی ساتھ اڑائی
پلکوں کے سائے میں چھپ کر آنسو پینا سیکھ لیا

دھرتی کتنے ناچ نچائے، تب اک کوڑی جیب میں آئے
ایڑی سے چوٹی تک پہنچے کیسے پسینا، سیکھ لیا

اپنے آپ پہ کیوں اترائیں اپنے آپ کو کچھ سمجھائیں
کبھی کبھی ہے جھوٹ بھی کہتا یہ آئینہ سیکھ لیا

○

یہ مانا ہم نے یہ دنیا انوکھی ہے نرالی ہے
چلے گی چال کیا ہم سے ہماری دیکھی بھالی ہے

عزیزو! تم کو میری چشمِ تر سے کتنا شکوہ تھا
چلو اب خوش رہو، اپنا یہ پیمانہ بھی خالی ہے

ہر اک غم کا مداوا ایک بے معنی تبسّم ہے
میرے دل کا بھروسہ کیا بہت ہی لا اُبالی ہے

کہیں محفل جمائیں ہم بھی اب پینے پلانے کی
یہ کیا کم ہے ہمارے پاس جو جام سفالی ہے

جو کچھ احوال ہے اپنا بیاں کرنے سے کیا حاصل
زبانِ خامشی صاحب دلوں کا طرزِ عالی ہے

○

کیوں رو رو کر نین گنوائیں، رونے سے کیا ہوتا ہے
سو جا اے دل تو بھی سو جا، سارا جگ ہی سوتا ہے

جس سے چاہیں دل کو لگائیں، دنیا والے کیوں سمجھائیں
اتنی بات تو سب ہی جانیں، پیت دُکھ ہی ہوتا ہے

میں اور تو میں بھید نہیں کچھ، واحد جمع برابر ہیں سب
سارے دھارے اس سے پھوٹیں سب سے بڑا جو ہوتا ہے

نئی چندریا، پھٹی گدڑیا، سب دھوبی کے گھاٹ پہ جائے
سب کے میل کو اک پانی سے، دھونے والا ہوتا ہے

○

گھر میں بیٹھے سوچا کرتے، ہم سے بڑھ کر کون دکھی ہے
اک دن گھر کی چھت پر چڑھے تو دیکھا گھر گھر آگ لگی ہے

جانے ہم پہ کیا کیا بیتی تن کا لہو سب صرف ہوا
رُخ کی زردی بھی ہے غنیمت، اب تو اپنی یہی پونجی ہے

اپنے آپ کو سمجھاتے ہیں، رات ڈھلی اب تو بھی سو جا
ہم ہی اکیلے کیسے سوئیں دل کی دھڑکن جاگ رہی ہے

ہر دم فکر کے موتی رولیں، پر دو میٹھے بول نہ بولیں
بھید یہاں کے کس پہ کھولیں، دنیا ہی کنگال ہوئی ہے

سیّد نگری[1] نئی نرالی، بھور بھئے سب رڈی والے
روز پکاریں ''رڈی بیچو'' آخر کتنی رڈی ہے

۱۔ سرسید نگر، علی گڑھ

O

میں کہاں ہوں کچھ بتادے، زندگی اے زندگی!
پھر صدا اپنی سنادے، زندگی اے زندگی!

سو گئے ایک ایک کر کے خانۂ دل کے چراغ
ان چراغوں کو جگادے، زندگی اے زندگی!

وہ بساط شعر و نغمہ، رت جگے وہ چہچہے
پھر وہی محفل سجادے، زندگی اے زندگی!

جس کے ہر قطرے سے رگ رگ میں مچلتا تھا لہو
پھر وہی اک شے پلادے، زندگی اے زندگی!

اب تو یاد آتا نہیں کیسا تھا اپنا رنگ روپ
پھر مری صورت دکھادے، زندگی اے زندگی!

ایک مدت ہوگئی روٹھا ہوں اپنے آپ سے
پھر مجھے مجھ سے ملادے، زندگی اے زندگی

جانے برگشتہ ہے کیوں مجھ سے زمانے کی ہوا
اپنے دامن کی ہوا دے، زندگی اے زندگی!

رَچ گیا ہے میری نس نس میں مری راتوں کا زہر
میرے سورج کو بلادے، زندگی اے زندگی!

O

اک پل نہیں قرار کہ گردش بہت ہے یاں
ارض و سما کی ہم پہ نوازش بہت ہے یاں

ہر آنکھ اپنی پلکوں کے سائے تلے ہے نم
ہر سر پہ ہیں گھٹائیں کہ بارش بہت ہے یاں

لب سی لیے ہیں ہم نے کہ نکلا جو کوئی لفظ
کیا کیا نہ گل کھلائے کہ سازش بہت ہے یاں

کس راستے پہ جاؤں چلوں کس کے ہم رکاب
جمتے نہیں ہیں پاؤں کی لغزش بہت ہے یاں

ایک ایک بوند تن کا لہو صرف ہوگیا
زخمِ جگر کی اپنے تراوش بہت ہے یاں

آدم کے واسطے یہ زمیں تنگ ہوگئی
آدم نما کو حقِ رہائش بہت ہے یاں

O

اپنی بستی چھوڑ کر پردیش میں جائیں گے کیا
یاں تو ہے نانِ جویں بھی واں مگر کھائیں گے کیا

ہر طرف اک سنگباری، گھر سے نکلیں کس طرح
سر سلامت ہی نہ ہو تو سر کو سہلائیں گے کیا

اپنی اپنی فکر سب کو، اپنے اپنے سب کو غم
کوئی مل جائے بھی تو اب دل کو بہلائیں گے کیا

کیسے پچھلی رات گزری، کیسے نیند آئی تمھیں
صبح کا سورج جو پوچھے گا تو بتلائیں گے کیا

ہم بھی تھے عالی دماغ اور ہم بھی تھے عالی نسب
گر کہیں اپنی زباں سے لوگ فرمائیں گے کیا

○

جی میں ہے معنی بے لفظ کو کیوں کر باندھوں
بس چلے اپنا تو قطرے کو سمندر باندھوں

گھر کی ویرانی یہ کہتی ہے کہیں اور چلوں
میں کہاں جاؤں، کہاں کے لیے بستر باندھوں

تشنگی اپنا مقدر ہے ، جزاک قطرۂ زہر
پاس کچھ بھی نہیں کیا بادۂ و ساغر باندھوں

ایسی زنجیر کہ بس ایک تمنا ہی رہی
کہ ہمیشہ کے لیے دستِ ستمگر باندھوں

میں نے کیا کیا نہ سنا روح کے سناٹوں سے
دل یہ کہتا ہے کہ اس رات کا منظر باندھوں

سگِ دیوانہ سے بدتر یہ سگِ دنیا ہے
ورنہ سوچا تھا کہ دونوں کو برابر باندھوں

○

میرے آنگن کو مہکادو
پھر جی چاہے مجھ کو بھلادو

او رستے کے چلتے راہی!
میں بھی چلوں گا مجھ کو دعا دو

او جی کو لے جانے والو!
پھر مجھ کو جینے کی سزا دو

میری دھرتی بہت ہے پیاسی
بادل بن کر رس برسادو

سویا سویا سا لگتا ہے
مجھ کو چھیڑو، مجھ کو جگادو

مجھ کو نیند نہیں آتی ہے
اپنی چادر مجھے اُڑھا دو

چھوٹی صبحیں، لمبی شامیں
آؤ ان کا فرق مٹا دو

میرے سنگی میرے ساتھی
دور پڑے ہیں اُن سے ملادو

○

پھر مری راہ میں کھڑی ہوگی
وہی اک شے جو اجنبی ہوگی

شور سا ہے لہو کے دریا میں
کس کی آواز آرہی ہوگی

پھر مری روح میرے گھر کا پتہ
میرے سائے سے پوچھتی ہوگی

کچھ نہیں میری زرد آنکھوں میں
ڈوبتے دن کی روشنی ہوگی

رات بھر دل سے بس یہی باتیں
دن کو پھر درد میں کمی ہوگی

بس یہی ایک بوند آنسو کی
میرے حصے کی رہ گئی ہوگی

پھر مرے انتظار میں مری نیند
میرے بستر پہ جاگتی ہوگی

جانے کیوں اک خیال سا آیا
میں نہ ہوں گا تو کیا کمی ہوگی

O

کہاں کی مے، کہاں کے جام و مینا
کوئی بتلائے جینے کا قرینا

عجب اک شے ہے زہر آگہی بھی
جسے بھی راس آئے اُس کا پینا

نہ جانے کون سا پھر سانحہ ہو
دھڑکتا ہے ابھی سے اپنا سینا

نہ دیکھا چشمِ تر نے کوئی موسم
وہی بس ایک ساون کا مہینا

نہیں اک بوند بھی باقی لہو کی
شکستہ تھا یہ دل کا آبگینا

مگر کچھ لوگ یوں بھی ڈوبتے ہیں
نہ تھا گرداب میں اُن کا سفینا

ہے اس کا آخری منزل پہ مسکن
چلے آؤ یونہی زینا بہ زینا

وہی اک بات جس کا ہم سے ڈر تھا
وہی اک بات ہم سے پھر ہونا

O

یہ تو میرا اپنا گھر ہے، تم اپنے گھر جاؤ میاں!
میرا تمھارا کیا ناتا ہے، کیوں مجھ کو اپناؤ میاں!

یہ دنیا ہے رنگ رنگیلی، اس کے کھیل نئے نرالے
کون اس کی تھاہ لگائے کتنا ہے گہراؤ میاں

کیسا سونا، کیسی چاندنی، کیسے کنکر، کیسے موتی
کون بڑی ہے کون ہے چھوٹی کس کا کتنا بھاؤ میاں

اپنے آپ کو دیکھو بھالو، اپنا آپا آپ سنبھالو!
اپنے دل کو خود سمجھالو جب جب ہارو داؤ میاں!

اپنے گھر کی سوکھی روٹی، اپنے گھڑے کا ٹھنڈا پانی
کھاؤ پیو اور خوش ہو جاؤ، بھولو نان پلاؤ میاں

اپنی چھت کیسی ہو ٹپکتی، راتیں ہیں اس میں ہیں کٹتی
کیسا ساون کیسا بھادوں، کیسا ہو برساؤ میاں

اپنے آپ کو خود ہی آنکو، اِدھر اُدھر مت تاکو جھانکو
کچھ نہ بنے تو مٹی پھانکو اس کا بھی اک تاؤ میاں!

کیسی ادھوری کیسی سگری، بھرلو اپنے من کی گگری
مت بھٹکو اب نگری نگری، خود اپنے بن جاؤ میاں!

O

شکستہ تر ہے جو اس خواب کے حصار میں ہوں
مگر میں کیا کروں خود اپنے انتظار میں ہوں

فصیلِ جسم کو توڑوں تو پھر کہاں جاؤں
جو عکسِ روحِ تپاں ہے اسی غبار میں ہوں

خود آپ اپنے سے الجھوں کہ آئینے سے کہوں
مجھے نہ ڈھونڈ کہ میں اک نہیں ہزار میں ہوں

جو حشر ہوگا سو ہوگا سفینۂ جاں کا
یہی بہت ہے کہ اک بحرِ بے کنار میں ہوں

مرے وجود کی سب کو خبر اسی سے ملی
جو غرقِ خوں ہے اسی تیغِ آبدار میں ہوں

خوش آگیا ہے مجھے کیوں خرابۂ ہستی
خیالِ مرگ بتا تو ہی کس دیار میں ہوں

ابھی خود اپنے معانی کی ہے تلاش مجھے
میں لخت لخت ہوں، اک سیلِ انتشار میں ہوں

O

اگرچہ غیر کے ہاتھوں لہو لہان ہوا
مگر میں اپنی طرف سے بھی بدگمان ہوا

جو پڑ گیا تھا کبھی خود مری نگاہوں پر
وہ ایک پردہ مرے حق میں آسمان ہوا

وہ جس کے واسطے دنیا تھی گوش بر آواز
وہ ماجرا مری آنکھوں ہی سے بیان ہوا

تلاش اس کی تھی مقصود، دیر و کعبہ کیا
ہمارا رُخ تھا جدھر اس کا اک نشان ہوا

ہمارے ظرف کو کیا آزماتے اہلِ ہوس
اسی بہانے خود ان کا بھی امتحان ہوا

بہت ملول تھے جس دامنِ دریدہ پر
وہی سفینۂ ہستی کا بادبان ہوا

ازل سے تھا وہ ہمارے وجود کا حصہ
وہ ایک شخص کہ جو ہم پہ مہربان ہوا

ذرا جو تیز چلے ہم تو کوئی ساتھ نہ تھا
حصارِ فکر ہی بس اپنا پاسبان ہوا

O

رُخ پہ گردِ ملال تھی، کیا تھی
حاصلِ ماہ و سال تھی، کیا تھی

ایک صورت سی یاد ہے اب بھی
آپ اپنی مثال تھی، کیا تھی

میری جانب اٹھی تھی کوئی نگہ
ایک مبہم سوال تھی کیا تھی

اس کو پاکر بھی اس کو پا نہ سکا
جستجوئے جمال تھی، کیا تھی

صبح تک خود سے ہم کلام رہا!
یہ شبِ جذب و حال تھی، کیا تھی

دل میں تھی پر لبوں تک آ نہ سکی
آرزوئے وصال تھی، کیا تھی

اپنے زخموں پہ اک فسردہ ہنسی
کوششِ اندمال تھی، کیا تھی

عمر بھر میں بس اک بار آئی
ساعتِ لازوال تھی، کیا تھی

خوں کی پیاسی تھی سرزمینِ وطن
ایک شہرِ خیال تھی، کیا تھی

باعثِ رنجشِ عزیزاں تھی
خوئے کسبِ کمال تھی، کیا تھی

اک جھلک لمحۂ فراغت کی
ایک امرِ محال تھی، کیا تھی

کوئی خواہاں نہ تھا کہ جنسِ ہنر
ایک مفلس کا مال تھی، کیا تھی

○

جلتا نہیں اور جل رہا ہوں
کس آگ میں، میں پگھل رہا ہوں

مفلوج ہیں ہاتھ پاؤں میرے
پھر ذہن میں کیوں ہے چل رہا ہوں

اک بوند نہیں لہو کی باقی
کس بات پہ میں مچل رہا ہوں

تم جھوٹ یہ کہہ رہے ہو مجھ سے
میں بھی کبھی بے بدل رہا ہوں

کیوں مجھ سے ہوئے گناہ سرزد
کہنے کو تو بے عمل رہا ہوں

رائی کا بنا کے ایک پربت
اب اس پہ یوں ہی پھسل رہا ہوں

کس ہاتھ سے ہاتھ میں ملاؤں
اب اپنے ہی ہاتھ مل رہا ہوں

کیوں آئینہ بار بار دیکھوں
میں آج نہیں جو کل رہا ہوں

اب کون سا در رہا ہے باقی
اس در سے میں کیوں نکل رہا ہوں

قدموں کے تلے تو کچھ نہیں ہے
کس چیز کو میں کچل رہا ہوں

اب کوئی نہیں رہا سہارا
میں آج پھر سے سنبھل رہا ہوں

میں کیوں کروں آسماں کی خواہش
اب تک تو زمیں پہ چل رہا ہوں

یہ برف ہٹاؤ میرے سر سے
میں آج کچھ اور جل رہا ہوں

مجھ کو نہ پلاؤ کوئی پانی
پیاسوں کے میں ساتھ چل رہا ہوں

کھانے کی نہیں رہی طلب کچھ
اب بھوک کے بل پہ پل رہا ہوں

○

اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا

غیروں نے مجھ کو دفن کیا شاہراہ پر
میں کیوں نہ اپنی خاک میں غیرت سے گڑ گیا

خلوت میں جس کی نرم مزاجی تھی بے مثال
محفل میں بے سبب وہی مجھ سے اکڑ گیا

بس اتنی بات تھی کہ عیادت کو آئے لوگ
دل کے ہر ایک زخم کا ٹانکا ادھڑ گیا

کس کس کو اپنے خونِ جگر کا حساب دوں
اک قطرہ بچ رہا ہے سو وہ بھی نبڑ گیا

یاروں نے خوب جا کے زمانے سے صلح کی
میں ایسا بددماغ یہاں بھی پچھڑ گیا

کوتاہیوں کی اپنی میں تاویل کیا کروں
میرا ہر ایک کھیل مجھی سے بگڑ گیا

اب کیا بتائیں کیا تھا خیالوں کے شہر میں
بسنے سے پہلے وقت کے ہاتھوں اجڑ گیا

○

درمیاں خود اپنی ہستی ہو تو ہم بھی کیا کریں
آئینہ دیکھیں کہ اپنے آپ سے پردہ کریں

ایک سے لگتے ہیں سب ہی کون اپنا، کون غیر
بے نقاب آئے کوئی تو ہم درِ دل وا کریں

حال کے سیلاب میں تو بہہ گئی ماضی کی لاش
دفن اب کس کی گلی میں ہم غمِ فردا کریں

ایک دو پل ہی رہے گا سب کے چہروں کا طلسم
کوئی ایسا ہو کہ جس کو دیر تک دیکھا کریں

کیوں نہ خود اپنا لہو پی کر بجھائیں دل کی پیاس
کس کے گھر کا بھید کھولیں، کس کو ہم رسوا کریں

اب تو امڈا ہی چلا آتا ہے سیلِ آتشیں
چشمِ تر! ہم کس طرح سے پار یہ دریا کریں

یہ تو سچ ہے زہر لگتے ہیں ہمیں بستی کے لوگ
کس توقع پر مگر آباد یہ صحرا کریں

پاس اپنے کیا رہا بس ایک غرورِ مفلسی
اس کی کیا قیمت لگائیں، اس کا کیوں سودا کریں

سر پھرے سب جمع ہوں سب کے سروں پر ہوں چراغ
بس چلے تو ہم بھی ایسا جشن اک برپا کریں

○

ہم تو گدائے گوشہ نشیں ہیں ہم کو غرورِ کمال نہیں
یہ بستی تو بہت بڑی ہے ہم جیسوں کا کال نہیں

گھر میں بیٹھے بیٹھے اکثر سوچتے ہیں ہم گھر میں نہیں
بس اتنی سی بات ہے ہم میں جس کی کوئی مثال نہیں

تنہائی میں بیٹھ کے خود ہی اپنے آنسو گنا کریں
یہ موتی کیا سب کو دکھائیں ایسا ویسا مال نہیں

ہم نے ساری عمر گنوائی اک گھاٹے کے سودے میں
اپنی خوشی سے ایسا کیا ہے، ہم کو اس کا ملال نہیں

○

طرز جینے کے سکھاتی ہے مجھے
تشنگی زہر پلاتی ہے مجھے

رات بھر رہتی ہے کس بات کی دُھن
نہ جگاتی نہ سلاتی ہے مجھے

آئینہ دیکھوں تو کیوں کر دیکھوں
یاد اک شخص کی آتی ہے مجھے

بند کرتا ہوں جو آنکھیں، کیا کیا
روشنی سی نظر آتی ہے مجھے

کوئی مل جائے تو رستہ کٹ جائے
اپنی پرچھائیں ڈراتی ہے مجھے

اب تو یہ بھول گیا کس کی طلب
دیس پردیس پھراتی ہے مجھے

کیسے ہو ختم کہانی غم کی
اب تو کچھ نیند سی آتی ہے مجھے

اپنی آنکھوں میں چھپالے کوئی
ورنہ ہر آنکھ بلاتی ہے مجھے

O

سایہ ہوں کوئی کہ اب شفق ہوں
اس بات پر آج خود بھی فق ہوں

سینے میں ہیں بند کتنے سورج
کہنے کو میں ایک ہی اُفق ہوں

اپنے کو بھی پاسکا نہ اب تک
تہہ دار ہوں اور در طبق ہوں

دیکھو مرا چہرہ تمتمایا
سونا ہوں کہ اس کا اک ورق ہوں

اب اور کوئی کتاب پڑھ لو
میں بھی ہوں کتاب پر ادق ہوں

ابنِ انشا کی یاد میں

○

ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی! اے زندگی! رتبہ رہے بالا ترا

اپنا مقدر تھا یہی، اے منبعِ آسودگی
بس تشنگی، بس تشنگی، گو پاس تھا دریا ترا

اس گام سے اُس گام تک زنجیرِ غم کے فاصلے
منزل تو کیا ہم کو ملے، چلتا رہے رستا ترا

تو کون تھا کیا نام تھا تجھ سے ہمیں کیا کام تھا؟
ہے پردۂ دل پر ابھی دھندلا سا اک چہرہ ترا

سورج ہے گو نامہرباں، ہے سر پہ نیلا سائباں
اے آسماں! اے آسماں، دائم رہے سایہ ترا

متفرق اشعار

○

سب سوئے اپنی اپنی چادر میں منھ چھپا کر
اک میری بیکسی ہے جو اب بھی جاگتی ہے

○

اس جھوٹ سے بالآخر کب تک نباہ ہوگا
جب دل ہے زخم خوردہ ہونٹوں پہ کیوں ہنسی ہے

○

خدا کرے کہ انھیں اور کچھ ثبات ملے
یہ چند صورتیں جن پر ہے آدمی کا گماں

○

جی چاہے تو ڈھونڈو کوئی جینے کا بہانہ
ورنہ غمِ ہستی سے یہاں کس کو مفر ہے
بے تیشہ یہاں راہ نکلتی نہیں کوئی
دل والو! سنو سنگ دلوں کا یہ نگر ہے

○

ہم پر پڑا ہے وقت مگر اے نگاہِ یار
کوئی کمی نہ ہوگی ترے احترام میں
ہر سمت آتی جاتی صداؤں کے سلسلے
ہم خود کو ڈھونڈتے ہیں اسی اژدہام میں

کتبہ 1

خدایا! نہ میں نے کہیں سر جھکایا
نہ دنیا میں احسان اب تک کسی کا اٹھایا
مرے سر پہ جب دھوپ ہی دھوپ تھی
اس گھڑی میں نہ ڈھونڈا کہیں کوئی سایہ
تو اب تو ہی آ کر مری آبرو کو بچا لے
یہی ایک تحفہ ہے
جو میں ترے پائے اقدس پہ رکھ دوں گا
اور یہ کہوں گا
یہی میری پونجی، یہی ہے کمائی
مجھے اور کچھ بھی عطا کر نہ پائی
یہ تیری خدائی
خدایا!
مری نذرِ بے مایہ کو دیکھ کر
جس خزانے میں اس کی جگہ ہو
اب وہاں پر اسے ڈال دے

کتبہ 2

یہ اس شخص کی قبر ہے
جس کے اب جسم کا کوئی ذرّہ یہاں پر نہیں ہے
نہ اس کو کوئی کام اس قبر سے
نہ اس کو خبر ہے
کہ یہ کس کا گھر ہے
تو اس شخص کے ایک بے نام گھر کو
کوئی کیوں کسی نام سے آج منسوب کر دے

اور اس نام کا ایک کتبہ بنائے
یہ دنیا ہے جس میں، نہ ایسا کوئی گھر بنا ہے نہ آگے بنے گا
کہ اس کا مکیں اپنے گھر میں ہمیشہ رہے گا
تو اب کیا کوئی گھر؟
اور اس گھر پہ اک نام کندہ ہے
کہ جس مرحلے پر کسی کو کسی گھر کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

کتبہ 3

مری قبر پر ایک کتبہ تو ہے
پر مرا نام اس پر نہیں ہے
مرا نام جو کچھ بھی لکھا گیا تھا
وہ اب مٹ چکا ہے
یہ کتبہ سفید اور سادہ سا ہے
مگر خالی خالی اسے دیکھ کر
ہر اک آنے والا یہ کہتا ہے کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟
بتاؤ کوئی شخص ایسا بھی ہے
مرا کوئی ہمدرد، میرا معاون
جو آئے اور آکر مرے سادہ کتبے پہ اپنا بھلا سا کوئی نام لکھ دے
اور کوئی اس سے پوچھے کہ اے مسخرے!
تو تو زندہ ہے، موجود ہے
پھر ترے نام کی قبر کیسی؟
کیا کوئی یہ ترا کھیل ہے؟
اور وہ شخص پھر یہ کہے:
تم سے مطلب؟
یہ مری قبر ہے، ہاں مری قبر ہے
میں اسی قبر میں دفن ہوں!!

کتبہ 4

وہ اک شخص تھا
جو اکیلا تھا اس کا کوئی بھی نہ تھا
اک اکائی تھا وہ
اور اک دن خود اپنی اکائی میں ضم ہو گیا
اس نے مرتے ہوئے اک وصیت لکھی
جس میں لکھا تھا!
اے آدمی!
اے وہ اک شخص
جو مرے مرنے کی پہلی خبر سن کے دوڑے
اور آواز دے بھائیو آؤ اس کا جنازہ اٹھاؤ
اور اس آواز پہ کوئی آواز اس تک نہ پہنچے
اور پھر مجھ سے بیکس اکیلے کو کاندھوں پہ اپنے دھرے
اور اکیلی سی اک قبر میں مجھ کو پہنچا کے محفوظ کر دے
میرا وہ دوست اتنا سا احسان مجھ پر کرے
وہ مری قبر پر ایک سادہ سا کتبہ لگائے
اور اس پر مرا نام لکھ دے
سچ کہوں اس سے میں اپنی شہرت نہیں چاہتا
کیا مرا نام اور کیوں وہ باقی رہے
میں اس واسطے چاہتا ہوں کہ جب
شہر کے لوگ یہ سن کے دوڑیں
کہ دیکھو یہ مشہور ہے، لوگ کہتے ہیں وہ شخص تو مر گیا
سوچتے ہیں یہ اسی کی شرارت نہ ہو
تا کہ ہم لوگ اب اس سے غافل رہیں
اس کے فتنے سے اپنے کو محفوظ سمجھیں

بس یہی چاہتا ہوں
کہ ایسا کوئی شخص ڈھونڈ ے مجھے
تو سہولت ہو اس کو یہ تصدیق کرنے کی
یہ شخص سچ مچ نہیں ہے
وہ اب مر چکا ہے
میں تو اب دشمنوں کے بھی آرام کے حق میں ہوں
کیوں کسی کو کسی سے خلل ہو؟
کیوں کسی نام سے ایک دہشت ہو؟
سارے انسان دنیا میں آرام سے سوئیں اور خوش رہیں۔

کتبہ 5

یہ کتبہ فلاں سن کا ہے
یہ سن اس لیے اس پر کندہ کیا
کہ سب وارثوں پر یہ واضح رہے
کہ اس روز برسی ہے مرحوم کی
عزیز و اقارب، یتامیٰ، مساکین کو
ضیافت سے اپنی نوازیں، سبھی کو بلائیں
کہ سب مل کے مرحوم کے حق میں دستِ دعا کو اٹھائیں
زباں سے کہیں اپنی ''مرحوم کی مغفرت ہو''
بزرگِ مقدس کے نامِ مقدس پہ بھیجیں درود و سلام
سبھی خاص و عام
مگر یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے
عزیز و اقارب کا شرب و طعام
اور اس کا نظام
الگ ہو وہاں سے

جہاں ہو یتامیٰ، مساکین، اندھے، بھکاری
پھٹے اور میلے لباسوں میں سب عورتیں اور بچے
کئی لولے لنگڑے، مریض اور گندے
وہی جن کو کہتے ہیں ہم سب عوام
وہاں ہوگا اک شوروغل، اژدہام
یہ کردیں گے ہم سب کا جینا حرام

کتبہ 6

میرا پیارا ننھا یہاں سو رہا ہے
اُسے پھول سے پیار تھا
وہ خود پھول تھا
میں ہر صبح آتا ہوں کچھ پھول لے کر
اسے تازہ پھولوں کی چادر سے ڈھک کر
چلا جاتا ہوں
تاکہ کل صبح تک اس کی معصوم روح
اپنے پھولوں کی آغوش میں
مسکراتی رہی۔

بھائی

پچھلی رات کو نیند نہ آئی — میں نے اک تصویر بنائی
اس تصویر نے مجھ سے پوچھا — کون ہو تم اے میرے بھائی
میں بولا اک قیدی ہوں میں — جس کی قسمت ہے تنہائی
اندھے کنوئیں میں ڈال کے اک دن — رخصت ہو گئے میرے بھائی
اس دن سے سب بھول گیا میں — کیا نیچائی کیا اونچائی
کیسا اندھیرا کیسا اُجالا — کیسی آنکھیں کیا بینائی
کیسے پہاڑ اور کیسے جنگل — کیسی وادی کیسی ترائی
کتنی اونچی ہوگی چوٹی — کیسی ہوتی ہے گہرائی
کیسے بہتے اُبلتے چشمے — کیسی دریا کی لمبائی
کیسی ہوتی ہیں دیواریں — کیسی ہوتی ہے انگنائی
کیسے دن اور کیسی راتیں — کیسے پربت، کیسی رائی
کیسے شہر اور کیسی گلیاں — کیسے بجتی ہے شہنائی
اب کچھ یاد نہیں آتا ہے — کیا اپنی ہے کیا ہے پرائی
تب تصویر یہ مجھ سے بولی — میرے بھائی میرے بھائی
پورب، پچھم، اتر، دکھن — کچھ دیتا ہے تم کو دکھائی
میں کیا کہتا کچھ نہ بولا — دور کی اک آواز سی آئی

بھائی! بھائی! بھائی! بھائی!

نیند پیاری نیند

جب کھلی آنکھوں سے اپنے آس پاس
دیکھتا ہوں اپنی دنیا، کس قدر محدود و تنگ
اور پھر
اک جاگتے لمحے میں میں
بند کر لیتا ہوں اپنی آنکھ اور
دیکھتا ہوں سامنے پھیلا ہوا اک جہانِ بے کنار
دیکھتا ہوں اپنی ہی آنکھوں سے وہ سارے مناظر
شہر اور آبادیاں
سیکڑوں صدیوں سے جو محفوظ ہیں
کس کو دیکھوں کس کو چھوڑوں
ایسی اک دنیا نہ جس کا اور چھور
نہ تو سمتیں اور حدیں
اور افق ناپید، غائب آسماں
سوچتا ہوں آہ میرا یہ سفر کتنا طویل
فاصلے اتنے کہ ان کی اب کوئی منزل نہیں
طے کروں گا اور تھک جاؤں گا میں
اور میری نیند روٹھی ہی رہے گی تاکہ میں آرام لوں
کھول دیتا ہوں یہ آنکھیں
اور اب خوش ہوں چلو فرصت ملی اس مفت کی بیگار سے
کیا بتاؤں میرے اندر اس دم
دو نئی آنکھیں نکل کر
میری آنکھوں کی جگہ لیتی ہیں
پھر پہنچ جاتا ہوں اس دنیا میں

جس سے بھاگ کر آیا تھا میں
پھر وہی سارے مناظر شہر اور آبادیاں
جیسے اک آسیب بن کر میرے سر پہ چھا گئیں
آہ مجھ کو کھا گئیں
کاش کوئی وہ کھلی آنکھیں مجھے واپس دلا دے
میں ہمیشہ کے لیے بن جاؤں گا اس شخص کا
آج تک وہ شخص میری آنکھ سے اوجھل ہے، میں
موت تک کیا سو سکوں گا

موت ہی وہ اپنی پیاری نیند ہے
جو ہمیشہ کے لیے اپنے مسافر کو سلاتی ہے
اسے تحفہ عطا کرتی ہے
جس کو ہم کبھی آرام کہتے کبھی امن وسکوں
میں اسی کی کالی زلفوں کا اسیر
میں اسی اپنی دلہن کا منتظر ہوں

مٹی کا گیت

مٹی کے سب رنگ انوکھے، سب دیوانے مٹی کے
مٹی کے سب کھیل کھلاڑی، نئے پرانے مٹی کے

مٹی کی یہ سندر کایا، مٹی کی ہی ساری مایا
کنکر پتھر، سونا چاندی، سولہ آنے مٹی کے
مٹی کے سب چہرے مہرے، مٹی کے سب ننگے پاؤں
مٹی کی یہ زلف گھنیری سب کے شانے مٹی کے
مٹی کی ننھی سی کیاری، مٹی کی مہکی پھلواری
مٹی کے یہ پھول یہ کلیاں سب کے دہانے مٹی کے
مٹی کے سب کھیت ہمارے مٹی کی پگڈنڈی بھی

مٹی کے ہریالے پودے، دانے دانے مٹی کے
مٹی کے سب پنگھٹ اپنے، مٹی کی سب سکھیاں
مٹی کے چمکیلے گگرے، کون یہ جانے مٹی کے
مٹی کی ماں بہنیں اپنی، مٹی کے ہیں بچے بالے
جھولا جھولیں سب مٹی کا سب کے ترانے مٹی کے
مٹی کی سی موہنی صورت، مٹی کی یہ اپنی گڑیا
مٹی کے سب دلہن دولہا تانے بانے مٹی کے

مٹی کے سب دادی دادا، مٹی کے سب نانی نانا
مٹی کے سب آنکھوں والے اندھے کانے مٹی کے
مٹی کے سب محل دو محلے، مٹی کی چھوٹی سی کٹیا
مٹی کے سب یہ دیے یہ شمعیں سب پروانے مٹی کے
مٹی کی سب گلیاں اپنی، مٹی کے سب گاؤں ہمارے
مٹی کے سب شہر بسے ہیں، سب ویرانے مٹی کے
مٹی کے سب ساقی دلبر، مٹی کے سب شیشہ و ساغر
مٹی کے سب جام و سبو ہیں سب پیمانے مٹی کے
مٹی کے سب دیوتا دیوی، مٹی کے سب گرجا مسجد
کیا سیتا کیا کالی ماتا سب افسانے مٹی کے
مٹی کی میٹھی سی بنسی، مٹی کی سی چنچل رادھا
مٹی سے کرشن کنہیا، سب کے گانے مٹی کے
مٹی کا بازار لگا ہے، کورے کورے سے برتن
کس کی صراحی کس کا پیالہ، سب پیمانے مٹی کے
مٹی کے چولھے پر ناچے سوندھی روٹی مٹی کی
جو کچھ چکی چاک میں پیسے، داتے دانے مٹی کے
مٹی کی خوشبو میں بسا ہے، مٹی کا یہ ذرّہ ذرّہ
مٹی کو مٹی ہی پکارے، حیلے بہانے مٹی کے
جھن جھن، جھن جھن، جھن جھن، کوڑی مٹی کے

کھن کھن گیت سناتے آنے مٹی کے
تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن، بولا طبلہ مٹی کا
ناچو، ناچو، ناچو، ناچو، سب رقصانے[1] مٹی کے
دھما دھما دھو، دھما دھما دھو، دھمکا مٹی کا تانڈو
اس کے پیچھے یا ہو، یا ہو سب ستانے مٹی کے
دھڑ دھڑ دھڑ دھڑ دھڑک رہی ہے، ہر ہر چھاتی مٹی کی
سر سر، سر سر، سرک رہے ہیں سارے شانے مٹی کے
مٹی مٹی، مٹی باجے، باجے کوچ کا نقارہ
گھر چل، گھر چل، گھر چل، گھر چل او ان مانے مٹی کے
مٹی مٹی، مٹی مٹی، مٹی موری گاتی ہے
سو جا ، سو جا، سو جا، سو جا او دیوانے مٹی کے
مٹی کی چادر میں چھپیں گے، قبر بنے گی مٹی کی
سب مٹی میں مل جائیں گے، ختم فسانے مٹی کے
ختم فسانے مٹی کے

○

ساقی! ساقی! ساقی! ساقی! میں متوالا ساقی کا
کم کم، کم کم، تھم تھم، تھم تھم پیالہ پیالہ ساقی کا
میں ساقی کا میں ساقی کا ساقی میرا ساقی میرا
میں نے چکھا میں نے چکھا منہ کا نوالا ساقی کا
اب جیوں جیوں رات ڈھلے گی، بزم سجے گی ساقی کی
ہلکے ہلکے ہوگا، ہوگا، اُجالا ساقی کا
کھل جا سم سم، کھل جا سم سم، سم سم کھل جا سم سم کھل جا
سب پہ سب پہ سب پہ سب پہ در کھلنے والا ساقی کا
دھیرے دھیرے دھیرے اٹھے، لو وہ اٹھے اُس کے پاؤں
دھیمے ، دھیمے، دھیمے ہلتا کان کا بالا ساقی کا

---

1. اجتماعی رقص کے لیے یہ لفظ میں نے خود وضع کیا ہے معلوم نہیں کہاں تک درست ہے۔ (خلیل الرحمن اعظمی)

ہلکی ہلکی، جھلکی جھلکی، بس اس کے رخساروں کی
چم چم چم چم چم چم چم چم چمکے سرخ دوشالہ ساقی کا
ڈھل ڈھل ڈھل ڈھل کرے صراحی کھل کھل کھل کھل جام وسبو
جگمگ جگمگ جگمگ کرتا، کیسا مالا ساقی کا
سہمے سہمے پیرِ مغاں سب، چپ چپ سے گلفام سبھی
اپنی اپنی چال چلے، ہر آنے والا ساقی کا
ناچے ناچے ساقی، نگر و جھن جھن بولیں پاؤں کے گھنگر و
سر سر چادر سرک رہی ہے، بڑھا اُجالا ساقی کا
سارے گاما سارے گاما گاما سارے گاما سا
دھیمے دھیمے سُر کو اٹھائے گانے والا ساقی
پانی دھاسا پانی دھاسا، دھاسا پانی پانی دھا
اپنا اپنا روپ دکھائے، آنے والا ساقی کا
ساقی نے سب سب کو پکارا، کون ہے میرا؟ کون مرا؟
بڑھ بڑھ کر سب ہی چلائے، بول ہے بالا ساقی کا
سب کو پلائے سب کو پلائے، سب کو چکھائے چکھائے
جھومے جھومے اور بھی جھومے گورا کالا ساقی کا
سب کو پکارے، سب کو بلائے سب کے سب کے جانے نام
اس محفل میں کون نہیں ہے جاننے والا ساقی کا
جھک جھک کر اٹھتا ہے ہردم بڑھ بڑھ کرتا سب کو سلام
اور بھی جھک جھک سجدہ کرتا ماننے والا ساقی کا
آؤ اب گھر لوٹ چلیں ساقی سے سلامِ رخصت لیں
دیکھو در پر جھوم رہا ہے اب تک تالا ساقی کا
ساقی! ساقی! ساقی اب بھی ساقی تب بھی ساقی
خوب یہ ہم نے اپنے دل میں روگ ہے پالا ساقی کا

ساقی! ساقی! ساقی! ساقی کہہ کر لوری گاتے ہیں
سوجا سوجا سوجا سوجا چاہنے والا ساقی کا

ساقی آیا ساقی آیا ساقی کا مستانہ بولا
آؤ اے ساقی! آ وَ رے ساقی اس کا اک دیوانہ بولا
ڈم ڈم کرتی، ٹم ٹم کرتی جاگیں پلکیں شمعوں کی
ہم بھی، ہم بھی، ہم بھی کہہ کر ساقی کا پروانہ بولا
کھٹ کھٹ، کھٹ کھٹ، پٹ پٹ پٹ پٹ کھل گئے، سب دروازے بھی
جے ہو، جے ہو، جے ساقی کی میخانہ میخانہ بولا
قُل قُل قُل قُل کرے ہے مینا، چھل چھل چھلکے شیشہ سے
سب کو پلا دے، سب کو پلا دے، پیمانہ پیمانہ بولا
پی لے، پی لے، پی لے، پی لے جی بھر بھر کے پی
چھن چھن، چھن چھن بولے گھنگرو، اس کا دانہ دانہ بولا
سب کو پکارے، سب کو پکارے، گھر کو پکارے، در کو پکارے
آئے آئے، آئے آئے، کاشانہ کاشانہ بولا
ہم بھی بولے تم بھی بولے، لب بھی بولے، آنکھیں بولیں
ہاتھ بھی بولے پاؤں بھی بولے، تن کا تانا بانا بولا
ہر گل بولا، بلبل بولا، شبنم بولی، موتی بولے
خوشبو مہکی، خوشبو دوڑی، خوشبو کا دیوانہ بولا
کلیاں مہکیں، چڑیاں چہکیں، مینا بولے، کوئل کوکے
کوکو، کوکو، کا کا، کا کا کوا بولا سیانا بولا
میرا ساقی، تیرا ساقی، اِن کا ساقی، اُن کا ساقی
آؤ ساقی، آؤ ساقی، آنا ساقی، آنا بولا
تم کو پلائے، ہم کو پلائے۔ سے کو پلائے خُم کو پلائے
اپنا پی لے، غیر بھی پی لے، منہ بولا پیمانہ بولا
دل بہلا دے، خوب پلا دے، دل میں کوئی پھول کھلا دے
تم کو مٹا دے کون مٹا دے؟ کون تمھارا؟ آنا بولا
میرا اپنا کوئی نہیں ہے، کون اب آئے؟ کون اب آئے؟

ہم ہیں تمھارے، ہم ہیں تمھارے، آؤ وہ مستانہ بولا
آؤ آؤ، آؤ آؤ، میرے دامن میں چھپ جاؤ
آتے ہو یا آتے نہیں ہو؟ اپنے سر کو ہلا نا بولا

اب تم میرے پاس رہو گے، اب تم میرے اپنے بنو گے
اب تو یہی تمھارا گھر ہے، اپنے گھر مت جانا بولا

ابّو پی چو[1]

آؤ ہم تم سب کو سنائیں قصے ابّو پی چو کے
روز ہی جھگڑے، روز ہی ٹنٹے، دھندے ابّو پی چو کے
نہ تو بڑے ہیں نہ ہی چھوٹے، دونوں کے دونوں ہی کھوٹے
امّی ان کی روز ہی پکڑیں جھوٹے ابّو پی چو کے
دونوں ہردم گتھم گتھا، دونوں میں چلتا ہے جوتا
سر پر کیسے بال اُگیں گے بھبرے ابّو پی چو کے

جس دن دیکھو کھیل کبڈی، ساتھی ان کے سبھی پھسڈی
ٹوٹے گی اوروں کی ہڈی، جوتے ابّو پی چو کے
دونوں کی ہردم کی لڑائی، ابّا نے کی خوب پٹائی
پڑے دھمادھم پڑتے تڑاتڑ ڈنڈے ابّو پی چو کے
بھاڑ میں جائیں ایسے بچے، پڑھنے لکھنے میں سب کچے
یوں دیکھو تو بھولے بھالے چہرے ابّو پی چو کے

دونوں کے دونوں میں ذہانت، داداؤں ناناؤں کی شرافت
کبھی کبھی دن آجاتے ہیں اچھے ابّو پی چو کے
دونوں پر پیار آجاتا ہے ہوتی ہے جب صلح صفائی
پھر ہاتھوں میں ان کے مٹھائی پیڑے ابّو پی چو کے

1 عدنان خلیل اور سلمان خلیل (مرحوم کے بیٹے)

ہم سب ان کو پاس بٹھاتے، سب ہیں اپنے ساتھ سلاتے
اچھے اچھے اور بناتے کپڑے اٹو پی چو کے
دونوں ہنساتے باری باری، دونوں رکھتے اپنی سواری
دوڑیں بھاگیں، گریں گرائیں، چرچے اٹو پی چو کے

کمّو صاحب

آ کے کبھی فرصت سے میرے پاس بھی بیٹھو کمو صاحب!
اپنے آپ کو اب پہچانو کچھ تو سوچو کمو صاحب!

چھوٹے تھے اب بڑے ہوئے تم، دیکھو اب کالج میں پہنچے
اصل پڑھائی تو اب ہوگی میری مانو کمو صاحب!

طارق بھی میرا ہے بھتیجا، کیسا نکلا اچھا نتیجہ
تم بھی خوب پڑھو پڑھاؤ اس سے سیکھو کمو صاحب!

اب جس عمر میں تم پہنچے ہو، اس میں ہے یہ ایک نزاکت
کنکر پتھر چھانٹ کے رکھو، موتی رولو کمو صاحب!

وقت سے آؤ وقت سے جاؤ، وقت سے جاگو، وقت سے کھاؤ
وقت سے گھومو، وقت سے سولو پھر تو دیکھو کمو صاحب!

وقت پہ جو بھی پالے قابو اس کو ملے گی علم کی خوشبو
وقت کی قیمت کیا ہوتی ہے اس کو جانو کمو صاحب!

وقت بگاڑے، وقت بنائے، وقت گرائے وقت اٹھائے
اس کو برتو اس کو پرکھو، اس کو جانو کمو صاحب!

وقت بڑی نعمت ہے خدا کی وقت بڑی طاقت ہے خدا کی
وقت کی کنجی، وقت کا تالا اس کو کھولو کمو صاحب!

وقت کا تالا کھل جائے گا تمھیں ملے گا ایک خزانہ
؟؟ پڑے گا دانہ دانہ مجھ کو لے لو کتو صاحب!

وہ تو کچھ بھی جان نہ پایا جس نے اپنا وقت گنوایا
وقت ہے چلتی پھرتی مایا اس کو سمجھو کتو صاحب

وقت تمھاری عمر بڑھائے وقت تمھیں پروان چڑھائے
وقت پہ مجھ کو یاد کروگے، میری دعا لو کتو صاحب!

ہُما[1]

میری پیاری پیاری بیٹی! میرے پاس بھی آؤ ہُما
چھوڑ کے اپنے گڈا گڈی ہم کو بھی بہلاؤ ہُما
امّی تم پر جان بچھائیں، تم کو اپنے پاس سُلائیں
خود اپنے ہاتھوں سے کھلائیں تم کو دودھ پلاؤ ہُما
ہم سب کی آنکھوں میں سماؤ تن من میں بس جاؤ ہُما
کھیلو اپنے کھیل کھلونے، اپنی گڑیا اپنا ڈبا
اپنے بندر، اپنے ہاتھی، اپنے لٹو لاؤ ہُما
لیپو پوتو اپنا چولھا چل کے پکاؤ ہنڈھکلیا
اپنی سکھی شادو کو بلاؤ اس کو خوب کھلاؤ ہُما
اپنے گھر کی یہ انگنائی، یہ لمبائی یہ چوڑائی
اُچھلو، بھاگو، کودو پھاندو، سب کو ناچ نچاؤ ہُما
کیسی تمھاری پیاری نانی تم کو سنائیں روز کہانی
کیسے ہوتے راجا رانی، ہم کو بھی بتلاؤ ہُما

کیسی تمھاری متو خالہ، تم کو کھلائیں اور نوالا
روٹھی روٹھی سی رہتی ہیں ان کو جا کے مناؤ ہُما

1۔ ہما فاطمہ (مرحوم کی بیٹی)

ماں

میرے بچّو!
یہ تمھاری ماں
جنھیں تم پیار سے امّی کہا کرتے ہو
میں بھی پیار میں
ان کو مریم کے لقب سے یاد کرتا ہوں
کبھی کہتا ہوں آ وَ راشدہ!
تم مرا یہ کام کر دو
ناشتہ مجھ کو کرا دو
اور میری میز پر
شیو کا سامان رکھ دو
میرے بچّو!
یہ تمھاری ماں ہی سب کچھ ہے
اور اسی کے پاؤں کے نیچے
تمھاری جنتیں ہیں
اور اسی کے ہاتھ پر لکھے ہوئے ہیں
نام تم سب بھائیوں کے
اور اک ننھی بہن کا
جو ابھی گڑیوں سے اپنی کھیلتی ہے
میرے بچّو!
صبح کو جب تم اٹھو
اپنی امّی کو کرو جھک کر سلام
اور پھر ان کی دُعا لو
سب سے پہلے یہ ہے کام

لوری

(ہما کے لیے)

سوجا پیاری پیاری سوجا
سوجا ہما ہماری سوجا
سوجا او ننھی سی تتلی
او پھولوں کی کیاری سوجا
سوجا ہما ہماری سوجا

چندا ماموں تجھے بلائیں
دودھ ملائی لے کر آئیں
آجا آجا آجا پیاری
ایک کہانی تجھے سنائیں
سوجا سب کی دُلاری سوجا
سوجا ہما ہماری سوجا

بھائی کہاں ہے کہاں ہے بھیا
کھیلیں سب کاغذ کی نیّا
کھیلیں مل کر کھیل کبڈی
دھوم مچائیں ہیّا ہیّا
بھیّا کو بھی پاس بلاؤ
اس سے کہو تم بھی سوجاؤ
سب تیرے بلہاری سوجا
سوجا ہما ہماری سوجا
پیاری نندیا تجھے بلائے
میٹھے میٹھے گیت سنائے
روز نئے سپنے دکھلائے

پھر سپنوں میں تو مُسکائے
او سپنوں کی کماری سوجا
سوجا ہما ہماری سوجا
سوجا او ننھی سی تتلی
اور پھولوں کی کیاری سوجا
سوجا سب کی دلاری سوجا
سب تیرے بلہاری سوجا
سوجا ہما ہماری سوجا
سوجا سوجا سوجا سوجا
سوجاسوجا
سوجا

اصحابِ فیل

(1)

کجلی بن سے آج اٹھے ہیں کالے کالے بادل
جھوما جھوما جھومتے جاتے کیسے ہیں متوالے بادل
کالے کالے ان کے تن ہیں، کالی کالی ان کی زباں ہے
کالی ماتا کے بیٹے ہیں سب کالی کے پالے بادل
کالے کالے بال ہیں سب کے کالی کالی آنکھیں سب کی
کیسا کالا کالا کاجل کالی آنکھ میں ڈالے بادل
کالے کالے رتھ میں بیٹھے کالے کالے ہاتھی سب کے
کالے ہاتھی کے کندھوں پر اپنا بوجھ سنبھالے بادل
کم کم کم کم کم کم کرتی لہراتی ہے ان کی کماں
چل چل چل چل چل چل کر کے تیر چلاتے بادل
کالی گھٹائیں، کالی ہوائیں کالی صداؤں کے لشکر
کل کل کل کل کل کل کر کے آج ہی آنے والے بادل
یاں یاں یاں یاں کر کے سب ہی اٹھائیں اپنے بان
جانے کس پر جانے کس پر بان اٹھانے والے بادل
کالے کالے سر پر کالا خود چڑھائے
کالی زرہیں، کالے بکتر، کالے بدن پر ڈالے بادل

کالے کالے کمربندوں سے کس کر کمریں کالی کالی
کالے کالے پاؤں میں سب کے جوتے پہنے کالے بادل
فیل سیہ پر بیٹھ کے آتی اپنی طرف یہ کس کی سپاہ
ابرہہ ابرہہ ابرہہ کر کے کھولتے اپنے لب
ابرہہ ابرہہ کون سا ابرہہ کون وہ شاہِ افریقہ
اپنا سب سے پرانا دشمن اس کو جانتے ہیں ہم سب

دیکھو دیکھو خانۂ کعبہ کی جانب ہیں بڑھتے جاتے
اپنے اپنے تیر و کماں کو اس کی سمت اٹھائے سب
یہ کعبہ تو اہلِ عرب کی سب سے بڑی نشانی ہے
یہ تو ان کے خدا کا گھر ہے، ان کا خدا جو سب کا رب
سب کا پالن ہارا جو ہے سب کا پیدا کرنے والا
سب ہی اس کے بندے ہیں لاکھوں ہیں رکھتے اس کے لقب
وہ تو ایک ہے، یکتا ہے، واحد ہے اور لاثانی ہے
اس کو اب تک ایک ہی مانیں ایک ہی جانیں اہلِ عرب
یہ کعبہ ہے اس کی اکائی اس کی وحدت کا اعلان
اس پرچم کے نیچے آ کر اس کی شہادت دیں گے سب
اس کی بنا رکھی تھی نبی نے جن کا نام تھا ابراہیمؑ
اسماعیلؑ تھے جن کے بیٹے اور خلیل تھا جن کا لقب
اتنے بتوں سے ہم کو چھڑایا، ایک خدا کا نام بتایا
ایک خدا سے ہم کو ملایا ایک خدا کے ہیں ہم سب
ایک خدا کو کرو معبود، باقی سب کو کرو نابود
ایک خدا ہے ایک خدا ہے ایک خدا ہے اپنا رب
ایک خدا کا یہ ہے کعبہ، ہم نے بنایا اپنا قبلہ
اس قبلے کی جانب کر کے سر کو جھکاتے ہیں ہم سب
کس کے بیر بہادر ہیں سب یہ کس کے منہ بولے ہیں
ابرہہ ابرہہ کر کے منہ سے کچھ ہیں نکالے بادل
ابرہہ ابرہہ کون سا ابرہہ یہ کس دیس کا باسی ہے
کس پہ چڑھائی کرنے نکلے دَل کے دَل یہ کالے بادل
بڑھتے جائیں بڑھتے جائیں ملکِ عرب کے صحرا میں
اس چٹیل میں کیا رکھا ہے کیا ہیں پانے والے بادل
اس میداں میں خارِ مغیلاں یہ میداں سنسان بیاباں
سخت نکیلی چٹانوں پر کیا برسانے والے بادل

ریت کے ٹیلے، ریت کے جھونکے، ریتیلے سب تند بگولے
ریتیلی سی تیز ہوا سے کیوں ٹکرانے والے بادل
ریت پہ پانی برسا بھی تو ریت میں سب مل جائے گا
ریت کا محل کہاں بنتا ہے، کون بنانے والے بادل
ریت پہ جو دیوار اٹھے گی، ریت کی پھر بن جائے گی
کون سی پھر دیوار اٹھا کر چھت کو چھانے والے بادل
کس ناداں نے ان سے کہا ہے ریت کی جانب کیوں بھیجا ہے
ریت میں دھنس دھنس جائیں گے سب اس کے رکھوالے بادل
ریت ہی ریت ہے ریت ہے اس جا ریت بڑی ہی ظالم ہے
دیکھے نہیں ہیں جھیلے نہیں ہیں ریت کے سنگیں بھالے بادل

(2)

کالی فضا کو کالی گھٹا کو دیکھ کے نکلے اہلِ عرب
اسود اسود اسود کہہ کر آئے سارے عالی نسب
دیکھا قبلے کی جانب بڑھتا جاتا ہے ابرِ سیہ
ابرِ سیہ کیوں فیل سیہ ہیں روئے سیہ کے ہیں دشمن
اس قبلے کی جانب جھکنا اس کے آگے جھکنا ہے
اس قبلے کی بڑی ہے حرمت اس قبلے کی سب کو طلب
یہ قبلہ میراث ہماری، یہ قبلہ سرمایا اپنا
اس کا جو بھی دشمن ہوگا اس کو مٹائیں گے ہم سب

(3)

جمع ہوئے سب اہلِ عرب بن گیا اک مطلبی لشکر
سب نے سوچا پہلے دیکھیں کون ہے، کیا ہے اور کیوں کر
گر یہ وہی ہیں دشمن اپنے ہم بھی کریں گے فوج کشی
فوج کشی سے پہلے دیکھیں اور ذرا آگے بڑھ کر

ہم پہچان لیں دشمن اپنا اور کر لیں اس کا اندازہ
کتنا ان کا شیرازہ ہے اور کیسا ہے ان کا لشکر
اہلِ عرب میدان میں آئے دیکھا سر پر آ پہنچا
یہ اصحابِ فیل وہی ہیں جن کا انھیں تھا پہلے ڈر
اتنا بڑا سا لشکر دیکھا ان کے جواں گھبرانے لگے
پھر ان کا سردار یہ بولا ان سے نامِ خدا لے کر
دیکھو دیکھو مت گھبراؤ، اپنے خدا کے نام پہ آؤ
ایک پہاڑی پر چڑھ جاؤ اور وہاں سے پھینکو کنکر
ہر کنکر پر پڑھتے جاؤ لیتے جاؤ خدا کا نام
پھر دیکھو گے ایک تماشہ اپنے خدا کا اک جوہر
اپنے خدا پہ بھروسہ رکھو اس کے نام پہ دل کو تھامو
اپنے خدا کو دکھلانے دو اپنی خدائی اب باطل پر
سب نے فلک کی سمت کو دیکھا اک آواز بلند ہوئی
دیکھو دیکھو اوپر کی جانب سے آتا اک لشکر
فیلِ سیہ کی فوج کے آگے آگے بڑھتا جائے

سرسر، سرسر، سرسر، سرسر، سرسر، سرسر
شہ شہ، شہ شہ، شہ شہ، شہ شہ
کرکر، کرکر، کرکر، کرکر، کر
چچ چچ، چچ چچ، چچ چچ، چچ چچ
چچ، چچ، چچ، چچ، چچ
پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں
پھر پھر پھر پھر پھر پھر پھر پھر پھر پھر
ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں ہاں
تھر تھر تھر تھر تھر تھر تھر تھر تھر تھر
ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا ہا
مر مر مر مر مر مر. مر مر مر مر مر مر

کن کن کن کن کن کن کن کن
کنکر کنکر کنکر کنکر کنکر کنکر کنکر
کنکر کنکر کنکر کنکر فیلِ سیہ پر برسائے
یہ تھی فوج ابابیلوں کی یہ تھا ایک خدائی لشکر

اہلِ عرب نے شان خدا کی دیکھی سب نے للکارا
مل کے کہو اللہ اکبر، مل کے کہو اللہ اکبر!

تانڈو ناچ

(1)

جاگ ری دھرتی جاگ ری دھرتی دیکھ یہ کیسا دھن
دھرتی تیری گود بھری ہے، پٹا ہوا آنگن
کہاں سے تیرے گھر برسے یہ نیلم، پکھراج
کہاں سے آئے ہیرے موتی، سونے کے کنگن
چم چم چمکیں لعل و جواہر دم دمکے شب گوہر
فیروزہ یاقوت و زمرد، مینا کاری سب کی جڑن
کہاں تھا ایسا تیرا خزانہ، کہاں تھا اتنا مال
کہاں تھی تیری ایسی مایہ کہاں تھی ایسی بھرن
دھرتی آنکھیں کھول دے اپنی، اب منہ سے کچھ بول
دامن بھر لے دامن بھر لے، بھر لے اب دامن
تیرے لیے ہے سب کچھ لایا، لے آیا طوفان
یہ طوفان دیا کرتا ہے کچھ ایسے ہی دھن
چاہے اس میں ڈوب ہی جائے (...[1]) کی ناؤ
چاہے اس میں نوح کی کشتی کا ناچے درپن

1۔ مختلف نسخوں سے موازنہ کے بعد بھی یہ لفظ نہیں مل سکا (مرتب)

(2)

کالے سمندر سے اٹھا ہے یہ کیسا اندھیاؤ
بستی بستی غراتا ہے، ہونک رہا ہے بن بن بن
ہاہا ہاہا ہاہا ہاہا کار مچی
ہو ہو ہو ہو کرتے ہو ہو کرتے باغ و چمن
ہوں ہوں ہوں ہوں کرتے جنگل پیڑ پہاڑ
بان باں بانسری باجے بانس بجے بن بن
شہ شہ شہ شہ شہ کرتے شہ کرتے شہتیر
دھر دھر دھر دھر گرتے گرتے ہیں دھرتی پہ دھرن
پربت پربت کو ٹھکرائے لوہا لوہے سے ٹکرائے
پھر دھرتی پہ گرتا جائے ہن ہن ہن ہن ہن
بغ بغ بغ بغ بغ کرتے بغ بغ باغ
کف کف کف کف کرتے کف کرتے مُردوں کے کفن
ساں ساں ساں ساں ساں پھول رہے سب سانس
پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں پھاں سب پھولوں کی پھبن
کر کر کر کر کر کرتی سب کانٹوں کی نوک
گڑ گڑ گڑ گڑ گڑ گڑ گڑتی سب تیروں کی گڑن
چٹ چٹ چٹ چٹ چٹ لگتی چٹانوں کی چوٹ
چبھ چبھ چبھ چبھ چبھ چبھتی ہر سوئی کی چبھن
پھنس پھنس پھنس پھنس پھنس پھنس پھنستی سارے بدن میں پھانس
گھس گھس گھس گھس گھس گھس سب گھاسوں کی گھسن

(3)

پانی پانی سب چلاتے لو وہ آیا پانی
بھاگے جائیں بھاگے جائیں بھاگیں سب کے بدن

کیوں لوگو پانی سے بھاگو پانی کا کیا پاپ
پانی ہی تو باپ تمھارا سب کے سب پانی کی بھرن
پانی کا قطرہ نہ پلاؤ بچہ چاٹے چھاتی
جھولے پہ پاؤں کو پٹکے گر جائے جھولے کی جھلن
سب کو اس کی پیاس ستاتی سب کی پیاس بجھائے پانی
تلسی داس مہا کوی ہوں یا ہوں سب جمو اور جمن
پانی کے پیاسے نہ بیٹھیں تخت پہ شاہ و دبیر
پانی ہی کی لیلا گائیں سب جوگی اور جوگن
پانی ہی کوئل بھی پیتی، پیتا کوا سیانا بھی
کبیرا روئے میرا گائے ناچے ہر برہن
مہاندی پر میلا لاگے، گنگا جمنا پر اشنان
پانی کو پانی میں ملائے برسائے دھرتی پہ گگن
پانی پانی پانی کہہ کر سب مرجاتے ہیں
پانی کو پانی ہی بلائے پانی ہی دیتا ہے کفن
پانی پانی پانی پانی میں سب ڈوبتے جائیں
سب پانی میں ڈوبتے جائیں دیکھو سب کی ڈُبن
سب سے اونچے محل بھی ڈوبیں سب سے اونچی ڈیوڑھی
سب سے اونچا گھر بھی ڈوبے سب سے اونچا آنگن
سب سے اونچے پیڑ کی پھنگی سب سے اونچی چڑیا
سب سے اونچا بنگلہ ڈوبے سب سے اونچا بھون
سب کے سب اونچے ہی ڈوبیں نیچوں کا کیا
ویسے نیچے بھی سب ڈوبیں سب کا نیچا پن
سب سے اونچی گھاس بھی ڈوبے سب سے اونچا بانس بھی ڈوبے
سب سے اونچا تھان بھی ڈوبے سب سے اونچے تھن
سب سے اونچا گرجا ڈوبے سب سے اونچا کنگورا
سب سے اونچا گھنٹا ڈوبے سب سے اونچی گھن

رمبا ڈوبے سمبھا ڈوبے، ڈوبے سب سے لمبا
چونسٹھ چونسٹھ کھمبا ڈوبے ڈوبے اس میں راون
سب سے اونچی اٹریا ڈوبے سب سے اونچی ڈوبے
سب سے اونچی نیا ڈوبے سب سے اونچا ہرن
سب سے اونچا تاڑ بھی ڈوبے، سب سے اونچا پہاڑ
سب سے اونچی جھاڑی ڈوبے، سب سے اونچا بن
سب سے اونچا رلیبہ ڈوبے، سب سے اونچا رتھ
سب سے اونچا ہاتھی ڈوبے، اونچے جس کے مچھن
سب سے اونچا نام بھی ڈوبے، سب سے اونچا کام بھی ڈوبے
سب سے اونچا دام بھی ڈوبے، سب سے اونچا دھن

(4)

پانی پانی پانی پانی، پانی میں اٹھتا ہے بھنور
ناچیں ناچیں ناچے جائیں سب کے تن من دھن
گھر گھر نر ناری ناچے، بیاہی ناچے کنواری ناچے
دھوتی ناچے، ساری ناچے، ناچے سب کا ننگا پن
نٹ ناچے نٹ کھٹوا ناچے، سب کے جیب کا بٹوا ناچے
موٹا ناچے، مٹوا ناچے، ناچے کامن کا موٹا پن
شہری اور دیہاتی ناچیں، شیو اور شیورانی ناچیں
باجے اور براتی ناچیں، ناچیں دولہا اور دلہن
گڈا ناچے گڑیا ناچے کاغذ کی اک پڑیا ناچے
اک بھولی سی بڑھیا ناچے دیکھو اس کا یہ بچپن
گول سی اک نارنگی ناچے چندری رنگ برنگی ناچے
جوگی کی سارنگی ناچے، ناچیں جوگی اور جوگن
بڑے بڑے دھنوانی ناچیں، ناچیں بڑے داتا
سر پر چٹیا ناچ رہی ہے، ناچا پھرے مہاجن

ناچیں کتنے میر اور مرزا، ناچیں صوفی مُلا
ناچے شیخ کے سر پر صافہ، دیکھو کھلتا جائے دھن
بڑے بڑے پنڈت علامہ ناچے سب کا جامہ جامہ
ناچے پگڑی اور عمامہ ناچیں ان کے مکر و فن
ایک مکٹ گردھاری ناچے، بگلا بھگت پجاری ناچے
سب کے ساتھ چماری ناچے، ناچیں بڑے بڑے باسن
سب کی ڈوبتی نیا ناچے، ماتی ناچے میا ناچے
تاتھا تاتھا تھیا ناچے، ناچے بڑا بڑا گاسن
ناچے ناچے جائیں ناچتے ناچتے جائیں ڈوبتے جائیں
پانی پانی پانی پانی سب کا تن

ناچ ری دھرتی ناچ ری دھرتی اپنا ناچ دکھادے
ناچے ناچے ناچے دھرتی کا تن من
ناچے ناچے ناچے ناچے اک جھنکار
جھن جھن جھنا جھنا جھن جھن جھن جھن جھن
ناچے ناچے ناچے ناچے اک تلوار
تر تر تر تر تر تر تر تر تر تر تن
ناچے ناچے ناچے ناچے ناچے تیز کٹار
کٹ کٹ کٹ کٹ کٹ کٹ کٹ کٹ کٹن
ناچے ناچے ناچے ناچے اک گھنکار
گھن گھن گھن گھن گھن گھن گھن گھن
ناچے ناچے ناچے ناچے اک بڑا فن کار
فن فن فن فن فن فن فن فن فن فن
ناچے ناچے ناچے ناچے ایک ستار
دھن دھن دھن دھن دھن دھن دھن دھن دھن دھن دھن
دھن دھن ناچے تن تن ناچے ناچے تیرا من

دھرتی بولے رام دہائی جے ہو کالی ماتا
کالی ماتا جیبھ نکالے پھن پھن پھن پھن
دھرتی بولے میّا میّا میّا میّا میّا ما
من من من من من من من من من من
دیّا دیّا دیّا دیّا ڈیّا دا
دن دن دن دن دن دن دن دن دن دن
نٹ نٹ نٹ نٹ نٹ نٹ آیا نٹ راج
دھم دھم دھم دھم دھم دھم دھم دھن
دھا دھاکو، دھا دھاکو ناچے تانڈو ناچے تانڈو
فنا فنا کو، فنا فنا کو دیکھو اس کا فن
اٹکن بٹکن دہی چٹاکن چور چمر گھر کھلا
شیام سمودر پانی کا جو در دد دمی رتن تلا
اروا گروا کھاداں لیکھ، سب کا اپنا اپنا بسیکھ
ٹھمک تیک، مہاکو ڈیکو پور تن پانی نیم کٹورا
اٹکا ٹیکا پھول بھی چٹکا بھینس بیاتی کالی مٹکا
کالا مٹکا بھٹکا بھٹکا اٹکا اٹکا کھٹکا کھٹکا
بھٹکا بھولا، بھولا بھولا پھولا پھولا ایک بگولا
ایک بگولا ایک بگولا، ایک بگولا بم سے پھوٹا
پھٹا پھٹا پھٹ پھٹا پھٹا پھٹ پھٹا پھٹا پھٹ پھا
پھٹا پھٹا پھٹ پھٹا پھٹا پھٹ پھٹا پھٹا پھٹ پھن
سارے گاما پانی دھاسا پانی دھاسا پا
سارے گاما پانی دھاسا پانی دھا سا پن
تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن دھینا
تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن، تاک دھنا دھن دھن
تا تا تھیا، تا تا تھیا تا تا تھیا تھا
تھن تھن تھن تھن تھن تھن تھن تھن

چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن چھن
بھن بھن بھن بھن بھن بھن بھن بھن ھن
جھن جھن جھن جھن جھن جھن جھن جھن گھن
گھن گھن گھن گھن گھن گھن گھن گھن ہن
ہن ہن ہن ہن ہن ہن ہن ہن دھن
دھن دھن دھن دھن دھن دھن دھن دھن من
من من من من من من من من تن
تن تن تن۔ تن تن تن تن تن تن تن
تن......

....

....

(ڈراپ سین)

خلیل الرحمن اعظمی نے اپنا ادبی سفر ترقی پسند ادبی تحریک کے زیر اثر شروع کیا مگر وہ عام ترقی پسندوں سے اس وقت بھی بہت مختلف تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ کاغذی پیرہن 1955 میں شائع ہوا۔ کاغذی پیرہن کی نظموں میں سیاسی وسماجی شعور کے ساتھ رومانی عناصر کی پرچھائیاں بھی صاف دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے کوئی دس سال بعد 1968 میں ان کا دوسرا مجموعہ نیا عہد نامہ شائع ہوا جس میں واضح طور پر ان کا میلان جدیدیت کی طرف محسوس ہوتا ہے۔ نیا عہد نامہ کے دیباچے میں پہلی بار انھوں نے ترقی پسندی سے اپنی مایوسی کا اظہار بھی کیا۔ نیا عہد نامہ خلیل الرحمن اعظمی کا نمائندہ مجموعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس مجموعے کی غزلوں اور نظموں میں خلیل الرحمن اعظمی اپنے فکر وفن کی بلندی پر نظر آتے ہیں۔ ان کی اس دور کی شاعری پر میر کا اثر واضح طور پر محسوس ہوتا ہے مگر یہ اثر ان کے اپنے لب ولہجے کی دریافت میں حائل نہیں ہوتا بلکہ معاون ثابت ہوتا ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی نے ماضی کے ادبی سرمایے کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اسی کا فیضان ان کی شاعری میں میر کے سوز وگداز اور نرم گفتاری اور آتش کے طنزیہ لہجے کی طرف جھکاؤ کی شکل میں ملتا ہے۔ ان کا تیسرا اور آخری مجموعہ زندگی اے زندگی 1983 میں یعنی ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔ "خلیل الرحمن اعظمی، ابن انشا اور ناصر کاظمی جدید شعرا کے ان پیش رووں میں سے ہیں جنھوں نے نئی شاعری کیلئے فضا تیار کی اور پھر وہ خود بھی اس منظر کا حصہ بنے جس کو انھوں نے ادب کے افق پر بے نقاب کیا تھا۔" خلیل الرحمن اعظمی کا یہ کلیات ان کی صاحب زادی ہما مرزا نے ترتیب دیا ہے۔

ISBN 978-93-87510-09-8
NCPUL
New Delhi

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون ایف سی 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔ 110025

₹ 145/-